اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

مئی۔جون ۲۰۲۳ء

اترپردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد :۵۱ مئی۔جون ۲۰۲۳ء شمارہ : ۱۱،۱۲

سرپرست : چیئرمین

ایڈیٹر : سکریٹری

معاون : محمد معاذ اختر احسن (سپرنٹنڈنٹ)

زرسالانہ : پچاس روپے -/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،

گومتی نگر لکھنؤ-226010

فون نمبر:0522-4022924

سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ، لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اکادمی، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
شاہ نصیرالدین کے شعری امتیازات	ڈاکٹر صابر حسن	۳
غزل	طلحہ تابش	۷
غزل	ڈاکٹر ثمیر کبیر	۷
مہدی حسین ناصری: افکار و آثار۔۔۔	وضاحت حسین	۸
غزل	ڈاکٹر بدر محمدی	۱۳
غزل	وارث رفیع	۱۳
جدید اردو شاعری میں محمد علوی کا مقام	غلام حسین	۱۴
غزل	ساحل عارفی	۲۱
غزل	منظور پروانہ	۲۱
ایک نابغہ روزگار شخصیت۔۔۔	سید غلام عباس	۲۲
غزل	ضیا خیرآبادی	۲۶
خواتین اودھ کی فکشن نگاری	اسلم مرتضیٰ	۲۷
غزل	عطیہ پروین	۲۹
قطعات شہباز امروہوی: ایک مطالعہ	ڈاکٹر روشن آرا	۳۰
نجم ردولوی ایک فراموش کردہ شاعر	انور حسین خاں	۳۴
غزل	نفیس خیرآبادی	۳۹
دسترخوانی اتحاد	اسد رضا	۴۰
ھزل	محفوظ رحمانی	۴۳
دلیر خاں کی دلیری	محمد طارق	۴۴
تبصرے	مبصر	۴۶
ایسے ایسے لوگ (شیخ رحمن اکولوی)	رحمت لکھنوی	۴۶

اداریہ

ہمارے معاشرے میں تبدیلیاں مسلسل رونما ہوتی ہی رہتی ہیں۔اس کے اسباب وعلل جو بھی ہوں۔ترقیات کے نام پر، جدیدیت کے نام پر، سائنس وٹکنالوجی کے نام پر یہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔عصری عہد سائنس،ٹکنالوجی اورالکٹرانکس کا ہے۔ موبائل، لیپ ٹاپ کمپیوٹراوراس سے وابستہ چیزیں آج ہرفرد کے لیے لازم بن چکی ہیں۔ان سے جہاں معاشرے وملک کی ترقی میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے، وہیں ان کے مضراثرات سے ہمارے تہذیب وتمدن، ثقافت اورادب کو بھی بڑا نقصان پہنچا ہے۔اخبارات، رسائل اور کتابوں کے قارئین کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔گو کہ بہت ساری کتابیں اور رسائل انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔بعض نئی نسل کے حضرات انٹرنیٹ پر ہی اخبارات ورسائل اور کتابیں پڑھ لیتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ابھی ان قارئین کی تعداد کثیر ہے جو ریفرنس کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال تو کر لیتے ہیں مگر انہیں ای میگزین اور ای بکس پڑھنے میں لطف محسوس نہیں ہوتا یا یوں کہوں کہ ان کو تسکین نہیں ملتی۔ریختہ جیسے ویب ادارے اردو کی نایاب کتابوں ورسائل کو اپنی سائٹ پر مہیا کر رہے ہیں جو تحقیق کرنے والے طلبہ نیز محققین وناقدین کے لیے ایک قیمتی تحفہ سے کم نہیں۔

ان سب ترقیات کے باوجود آج بھی اخبارات، رسائل اور کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔کتاب میلے میں کتابوں کے شائقین کی کثیر تعداد موجود رہتی ہے۔یہ وہی افراد ہیں جو کتابیں ورسائل خرید کر زبان وادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ہر برس کثیر تعداد میں کتابیں بھی شائع ہورہی ہیں، رسائل بھی چھپتے ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس کے تناسب میں قارئین کی تعداد کم ہی ہوتی جارہی ہے۔اگر یہی حال رہا تو (خدانہ کرے) وہ دن بھی دیکھنے پڑ سکتے ہیں کہ اردو زبان بھی پالی وپراکرت کی صف میں نظر آنے لگے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اپنی مادری زبان اوراس کے ادب کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کی ترقی وترویج میں سنجیدگی سے غور وفکر کیا جائے۔اردو کے اساتذہ اور محبان اردو کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس کی عمل آوری گاؤں، قصبات، محلوں اور شہروں میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر لے۔سب سے پہلے تو ہم اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھائیں۔اپنے گھروں میں اردو اخبارات و رسائل ضرور منگائیں۔بچوں کے ذوق کے لحاظ سے بچوں کے رسائل انہیں مہیا کرائیں۔ظاہر ہے کہ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب بھی ہے۔اس لیے آئیے صدق دل سے یہ عہد کریں کہ آج ہی سے اپنے بچوں کو ان کے کورس کے ساتھ ساتھ گھروں پر اردو تعلیم بھی دلانے کا بندوبست کریں گے۔

ایڈیٹر

سکریٹری، اردو اکادمی

ڈاکٹر سید صابر حسن
حضرت امیر خسرو نگر، مظفر پور (بہار)
Mob.9801659311

شاہ نصیرالدین کے شعری امتیازات

شاہ نصیر ۱۷۶۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام نصیر الدین اور تخلص نصیرؔ تھا۔ ان کے والد شاہ غریب نے ان کی تعلیم کا بڑا اہتمام کیا مگر اُن کی تعلیم مکمل نہ ہوسکی۔ ان کی طبیعت شروع ہی سے شعروشاعری کی طرف راغب تھی۔ اور انھواں نے شاہ محمدی مائلؔ کی شاگردی قبول کی اور شعرگوئی میں کمال حاصل کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی صحبت میں مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ اور آرزوؔ جیسے باکمال شاگرد ہوئے۔ شاہ نصیرؔ نے نوجوانی میں شعروشاعری کی ابتدا کی۔ اس وقت شاہ حاتمؔ، مرزا مظہر جان جاناں، سوداؔ، میرؔ اور دردؔ جیسے اعلیٰ مرتبت شعرا کی کہکشاں آسمان شاعری پر جگمگا رہی تھی۔ اردو غزل حسن وعشق، دردوغم، غم زیست، غم کائنات، ناپائیداریٔ حیات اور تصوف کی رنگارنگ تصویرکشی میں مصروف تھی۔ سوداؔ شہر آشوب اور دردؔ صوفیانہ غزلیں پیش کررہے تھے۔ یہ سارے رنگ کی دلکشی اوران خیالات کی جلوہ گری ہمیں شاہ نصیرؔ کی شاعری میں ملتی ہے۔ مذکورہ بزرگ شعرا کے بعد شاہ نصیرؔ ایک مقام خاص پر فائز نظر آتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی شعری محفلوں میں ان کی ان کی حاضر دماغی، نکتہ سنجی اور شعرفہمی ایک عرصہ تک قائم رہی۔ لکھنؤ اور حیدرآباد کے انھوں نے متواتر سفر کئے اور اپنی شاعری کے مرتبہ ومنصب کا سکہ جمایا۔

نصیرؔ کی شرکت مشاعروں میں بھی ہوتی رہی۔ ان مشاعروں میں معاصرانہ چشمک کا سلسلہ بھی خوب چلتا تھا۔ یہ مشاعرے وہاں کی تہذیبی زندگی کے آئینہ دار تھے اور شعراء زبان وبیان کا معیار قائم رکھنے کے لئے اپنی غزلوں میں حسن و نکھار پیدا کرنے کی حتی الامکان کاوش کرتے تھے۔ زبان کی فصاحت وبلاغت بھی ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ روزمرہ کے عام فہم الفاظ شعروں کو زینت بخشتے تھے۔ اور سامعین اور قارئین کے قلب وجگر کو شعرا کا کلام متاثر کرتا تھا۔ ان مشاعروں سے شاہ نصیرؔ کی شعری زبان بھی خاصی متاثر ہوئی۔ شاہ نصیرؔ کی شاعری میں سادگی ولطف بیان کے ساتھ سنگلاخ زمینوں میں گل بوٹے کھلانے کا ہنر بھی خوب آتا ہے اور اسی سبب سے وہ قادرالکلام شاعر کے عہدہ پر فائز نظر آتے ہیں۔ نصیرؔ کے زبان وبیان کی کیفیت سے ان کے شاگرد ذوقؔ بھی بے حد متاثر

ہوئے۔اس ضمن میں محمد حسین آزاد اُن کی شاعری پر اپنی قیمتی رائے یوں سپردِ قلم کرتے ہیں:

''نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے۔تشبیہ و استعارہ کو لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے۔ علم کے دعویدار شاعران کے کلام کی دھوم دھام کو ہمیشہ کن انکھیوں سے دیکھتے تھے اور آپس میں کانا پھوسیاں بھی کرتے تھے۔پھر بھی ان کے زورِ کلام کو دبا نہ سکے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ زورِ طبع ان کا کسی کے بس کا نہ تھا۔جن سنگلاخ زمینوں میں گرمیٔ کلام سے وہ مشاعرے کو تڑپا دیتے تھے اوروں کی غزل پوری کرنی مشکل ہوتی تھی۔''

محمد حسین آزاد۔''آبِ حیات''صفحہ ۳۷۳

محمد حسین آزاد نے شاہ نصیرؔ کی شاعری کی روشنی میں جو جائزہ لیا ہے وہ صداقت پر مبنی ہے۔نصیرؔ کی طبع رسا سنگلاخ زمینوں میں خوب حسن پیدا کرتی تھی۔اپنے شعروں میں تشبیہ اور استعاروں کا بھی استعمال شاہ نصیرؔ نے بڑی فنکاری سے کیا ہے۔کلام میں بڑا زور اور شعروں میں بڑی جاذبیت ہے۔ دردؔ کی سی سنجیدگی اور میرؔ کی درد و غم کی کیفیت سے ماحول میں یکسانیت اور بے کیفی کی فضا قائم ہوگئی تھی۔شاہ نصیرؔ کی شاعری نے خوشگوار فضا قائم کی اور تھکے اور پُر انتشار دلوں کو سکون بخشا اور اپنے شعروں میں اپنے حسن خیال کا وہ جادو جگایا کہ قاری پر ایک مسحور کن فضا طاری ہوگئی۔اس کے باوجود دردؔ، میرؔ اور سوداؔ کی غزلوں کا جو معیار و مرتبہ تھا اس درجے تک شاہ نصیرؔ کی غزلیں اپنا اثر قائم نہیں کرتیں۔پھر بھی وہ شعری محفل کی آبرو بنے رہے۔ شاہ نصیرؔ کی غزل میں عشق کی منزل بڑی دشوار گذار اور کانٹوں سے بھری ہے اور عاشق کے لئے یہ مناظر سوہانِ روح ہیں۔اس سلسلہ میں ایک دلچسپ غزل کے چند شعر پیش ہیں۔

پس دیوار تک گر، رخنۂ دیوار بیٹھے ہیں
ذرا تو دیکھ عاشق طالب دیدار بیٹھے ہیں
اٹھانے کے کسی کے کب اٹھے ہیں جو کوئی جم کر
ترے کوچے میں جوں نقش قدم اے یار بیٹھے ہیں
اُلجھتے کیوں ہو اے خار بیابان وفا، دیکھو
تمہارے ہم تو دامن سے لگے ناچار بیٹھے ہیں
اٹھے جو بلبلے کی طرح سے بحر حقیقت میں
وہیں پھر کھولتے ہی آنکھ کے اک بار بیٹھے ہیں

ان کی غزلوں میں تہذیبی روایت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

تیری اک جنبش مژگاں پہ ہو سودا دل کا
جنس دل بیچتے ہیں ہم خس و خاشاک کے مول

....

جلوۂ موجِ تبسم یار کا
برق کو دکھلا کے تڑپاتے ہیں ہم

چھیڑنے سے زلف کے الجھو نہ تم
پڑ گیا ہے پیچ سلجھاتے ہیں ہم

یہاں شاہ نصیرؔ کی زبان وبیان پر قدرت کا احساس ہوتا ہے اور اسی سے ان کی شاعری منفرد شان کی حامل ہے۔ الفاظ کو اپنے شعروں میں نگینوں کی طرح جڑنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ استعاروں اور تشبیہوں کا نظام بھی بڑا دلکش ہے۔اور اسی سبب سے شعریت اُبلی پڑتی ہے اور قارئین کے ذہن میں اپنی جگہ بناتی ہے۔ یہی شاہ نصیر کا انفرادی رنگ ہے۔انھوں نے عام شعرا کی زبان میں بھی اچھے شعر کہے ہیں۔چنداشعار یوں ہیں۔

لختِ دل آ کے جب آرائش مژگاں ہوئے
جھاڑ مژگاں کے سبھی سرو چراغاں ہوئے

....

جوش ہے موسم میں اس کا روز وشب اس کا خروش
ابر گریاں اور ہے، یہ چشم پُرنم اور ہے
تشنہ کامی کے سبب غنچہ نکالے ہے زباں
جام گل میں اے صبا کچھ آبِ شبنم اور ہے

....

کس کو ہوائے دشت نوردی ہے فصل گل
زنجیر پائے موجِ نسیم سحر مجھے

....

کیا جانے اب کدھر کو گئے حیف اے نصیرؔ
یارانِ رفتگاں کی نہیں کچھ خبر مجھے

....

فراقِ یار میں رونا نہ چھوڑئے تو نصیرؔ
بلا سے دیدۂ پُرنم رہے رہے نہ رہے

....

جوں نقش قدم خاک نشانِ رہِ عشق
تا حشر اٹھیں گے نہ اٹھانے سے کسی کے

....

شاہ نصیرؔ کے زبان و بیان میں شعری دبستان کی تخلیقیت ملتی ہے اور لب ولہجہ کی شیرینی و چاشنی کا عروج نصیرؔ کے دور سے شروع ہوتا ہے۔اس کے شاگرد داغؔ زبان و بیان کو اپنی شاعری میں مرتبہ بخشتے ہیں اور اپنی عاشقانہ شاعری میں بانکپن ونکھار،نشاط وطرب اور حسن ادا کی ایک نئی شعری ثقافت وتہذیب کی تخلیق کرتے ہیں۔پھر آئندہ چل کر اس کیفیت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔لیکن شاہ نصیرؔ کی شاعری میں محاورے اور روز مرہ کے استعمال سے حسن میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور ان کی یہ محاوراتی زبان دہلوی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور اسی سبب سے اُن کی شعری زبان، تہذیبی زبان کا روپ دھار لیتی ہے۔

کیوں مے کے پینے سے کروں انکار ناصحا
زاہد نہیں، ولی نہیں، کچھ پارسا نہیں

ہیہات کیا کہوں کہ وہ کہتا ہے بدگماں
پاؤں کو میرے ہاتھ، پرے ہٹ لگا نہیں
شیشہ کہے ہے جام سے جھک جھک کے بزم میں
روؤں گا خوب سا مجھے اتنا ہنسا نہیں

....

نصیؔر اس دور میں تب سیر کرنے کی ہے کیفیت
چمن ہو، جام مے ہو، خیمۂ ابر بہاری ہو

شاہ نصیؔر کی غزلوں کا رنگ و آہنگ سراسر عشق مجازی کی کیفیت سے لبریز ہے۔ اس میں بڑی شوخی اور دل پزیری ہے۔ دل لبھانے والی اداؤں سے لبریز ایک مرصع غزل کے چند اشعار پیش ہیں۔

لو لگ رہی ہے جس سے وہ شمع رو نہ آیا
بل بے تری شرارت یاں تک کبھو نہ آیا
ہو اس دہن سے روکش سیلی صبا کی کھائی
غنچے کے آہ منہ سے کس دن لہو نہ آیا
کیوں کر یہ ہاتھ اپنا پہنچے گا تا گریباں
دست خیال جس کے دامن کو چھو نہ آیا
اپنی بھی بعد مجنون یارو ہوا بندھی ہے
لے گرد باد خیمہ کب کوبہ کو نہ آیا
ہر دم نصیؔر رہ تو امیدوارِ رحمت
تیری زباں بہ کس دن لاتقنطو نہ آیا

....

سقف فلک کہنہ میں کیا خاک لگاؤں
اک ضعف دل اس آہ کا تھم اٹھ نہیں سکتا
دل پر ہے مرے خیمۂ ہر آبلہ استاد
کیا کیجئے کہ یہ لشکر غم اٹھ نہیں سکتا
یوں اشک زمیں پر ہیں کہ منزل کو پہنچ کر
جوں قافلۂ ملک عدم اٹھ نہیں سکتا

شاہ نصیؔر کی شاعری میں ظرافت کی چاشنی اور تشبیہات کی دل آویزی بڑی دلکش ہے۔ وہ فی البدیہہ اور برجستہ شعر کہنے کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ زبان کی اصلاح میں انھوں نے بڑی کاوش کی۔ الفاظ کے حسن استعمال پر بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ زبان و بیان پر قدرت فطری تھی۔ اس کے زور بیان سے شعروں میں لذت بخش دیتے تھے۔

شاہ نصیر نفیس الطبع اور نازک مزاج واقع ہوئے تھے۔ لباس فاخرہ ہمیشہ زیب تن رہتا تھا، مزاج میں شوخی و مزاح کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کی وضع قطع سے ان کی شرافت نفسی ہویدا تھی۔ اور لوگوں کی نظر میں عزت و احترام کے مالک تھے۔ ان کی ذہنی ذکاوت اور مزاج کی شرافت ان کی ہر دل عزیزی کا سبب تھی۔ شعری محفلوں میں اپنے بعض شعروں کے طفیل داد و تحسین کے حامل ہوتے تھے۔

اردو ادب کا یہ قادر الکلام شاعر ۱۸۴۰ء میں حیدر آباد اس دارِفانی سے ملک جاودانی کو رخصت ہوا۔

❑❑❑

طلحہ تابش
پرتاپ گڑھ-Mob.9044676517

غزل

سبق خلوص کا جس میں تھا اس کتاب کی یاد
ستا رہی ہے مجھے حضرتِ ربابؔ کی یاد

پسند جن کو اندھیروں کی حکمرانی تھی
سیاہ شب میں انھیں آئی ماہتاب کی یاد

تمام عمر بھلانے کی چاہ رکھتے ہوئے
بھلا سکے نہ کبھی ہم ترے سراب کی یاد

کسی حسین کی محفل میں پا کے اپنے کو
ابھر رہی ہے مرے ذہن میں شباب کی یاد

بس ایک بار کسی سے نظر ملائی تھی
پھر اس کے بعد نہ آئی مجھے شراب کی یاد

میں بے سکون رہا جس کو دیکھ کر برسوں
ملے جو آپ تو آئی اس ایک خواب کی یاد

لہو لعب میں جو گذری ہے زندگی تابشؔ
مجھے رُلاتی ہے اب وقت کے حساب کی یاد

●●●

ڈاکٹر ثمیر کبیر
جعفر نگر، ناگپور-Mob.9923459544

غزل

یاد کا کیوں ہے سلسلہ کوئی
ہم نے رکھا نہ رابطہ کوئی

آنکھ بھر اُن کی آنکھ میں دیکھا
پھر نہ اچھا لگا نشہ کوئی

بیٹھ جاتا ہوں ان کے کوچے میں
لوگ پوچھے ہیں، واسطہ کوئی؟

وہ جو منفی ہوا محبت میں
دے گیا مجھ کو ضابطہ کوئی

سب کہ اپنی تلاش میں گم ہیں
کس سے پوچھے گا راستہ کوئی

زندگی پھر کسی بہانے سے
یوں ملی جیسے حادثہ کوئی

وہ جو منزل بلا رہی ہے ہمیں
وہاں جاتا نہ راستہ کوئی

●●●

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

سابق ایڈیٹر نیا دور، لکھنؤ-Mob.988901003

’’مہدی حسین ناصری: افکار و آثار‘‘ کا سرسری جائزہ

بعض شخصیات عمیق حسیات کی حامل ہوتی ہیں۔ جنہیں مجسم اور مجرد احساس کہنا چاہیے۔ غور و خوض اور تفکر و تدبر کے عوامل ان کی شخصیت کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ زندگی میں ہر فرد کا بغور مطالعہ، مشاہدہ اور تجزیہ کرتی ہیں، اس لیے ان کا مطالعاتی اور تجزیاتی انداز جزیاتی نوعیت کا ہوتا ہے جس سے کلی استخراج بخوبی حاصل کیے جاسکتے ہیں ایسی ہی ایک شخصیت کا نام ہے ’’وقار ناصری‘‘

وقار ناصری ممتاز ادیب و شاعر پروفیسر مہدی حسین ناصرؔی کے پوتے ہیں۔ شاعری اور ادب کا رجحان انھیں ورثے میں ملا تھا۔ تقریباً 30 برس کی عمر میں ہی انہوں نے شاعری کرنی شروع کر دی تھی۔ ان کی تخلیقات و مضامین ’’شب خون‘‘، ’’نیا دور‘‘، ’’آفتاب‘‘، ’’ارتقا‘‘ وغیرہ کے علاوہ بیرون ملک کے موقر رسائل میں بھی شائع ہوئے۔ شروع میں ان کا رجحان شاعری کی طرف تھا لیکن ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنا ذہن خصوصی طور پر نثر کی طرف مرکوز کر لیا۔ ان کا شعری مجموعہ ’’پیش خیمہ‘‘، تلمیحات پر ’’نیرنگ تلمیحات‘‘، ’’انتخاب کلام ناصرؔی پر ’’غبار صحرا‘‘ مضامین کا مجموعہ‘‘، ’’شہرِؔ میر اور ناصر کاظمی‘‘، ناولٹ ’’خزاں کے دنوں میں محبت‘‘، دو ناول ’’قصہ خواب کہانی‘‘، ’’صحرا باغ‘‘ دو ہندی ناول شہر میں کرفیو (وبھوتی نرائن رائے) اور مہا شیو دیوی کا ترجمہ اردو میں کیا۔ انہوں نے قرۃ العین حیدر پر ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب ’’قرۃ العین حیدر: ایک ذہنی جلاوطن‘‘ اور مشہور و معروف شخصیت، اپنے دادا مرحوم کی حیات و ادبی خدمات پر ایک تحقیقی کتاب ’’پروفیسر مہدی حسین ناصرؔی: افکار و آثار‘‘ تصنیف کی جو ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئی۔ آخر الذکر دونوں کتابیں وقار ناصری کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

یوں تو وقار ناصری کی تخلیقات اور تصانیف پر ایک الگ سے کتاب لکھی جاسکتی ہے لیکن یہاں ان کی تصنیف ’’مہدی حسین ناصری: افکار و آثار‘‘ پر روشنی ڈالنا ہی مقصود ہے۔

دور حاضر میں عام طور پر لوگ پروفیسر مہدی حسین کو بحیثیت شاعر جانتے ہیں اور ان کا یہ مقطع زبان زد خاص و عام ہے۔

ناصرؔی قبر پہ عبرت کے لیے لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شب تنہائی کا

مگر یہ ناصری کی زندگی کا ایک رخ ہے۔ ناصری صرف شاعر نہیں تھے۔ وہ مترجم اور محقق ہونے کے ساتھ ہی ایک شفیق استاد اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کی تعلیم

وتربیت کے لئے ایک علمی سوسائٹی قائم کی تھی۔ان کواس بات کا بخوبی علم تھا کہ مغربی علوم کی تعلیم کے بغیر اب کوئی بھی طالب علم وہ علم حاصل نہیں کرسکتا جو بولتے ہوئے زمانے میں اس کا ساتھ دے سکے۔انہوں نے خود بھی کئی غیرملکی زبانوں میں دسترس حاصل کی تاکہ وہ ان علوم سے واقف ہوسکیں جو اس عہد میں ضروری تھے۔حقیقت یہ ہے کہ انہیں خوبیوں کی وجہ سے پروفیسر مہدی حسین ناصری کا ایک زمانہ معترف رہا۔

''پروفیسر مہدی حسین ناصری: احوال و آثار'' کا آغاز وقار ناصری کے مضمون ''حرف آغاز'' سے ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے اس کتاب کے منظر عام پر آنے کی روداد بیان کی ہے۔ان کی شخصیت ایسی تھی کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی بھی یہ چاہتے تھے کہ ان پر ان کے شعبہ سے ریسرچ کا کام ہو۔وقار ناصری کے مطابق پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی نے ان کی چھوٹی بہن سے ناصری اور ان کی ادبی خدمات کے موضوع پر ریسرچ کرنے کو کہا تھا۔ بقول وقار ناصری ان کی بہن نے اس پر کام شروع بھی کیا۔شروع میں دلچسپی بھی دکھائی مگر بعد میں اس کو چھوڑ دیا۔ ناصری کی شخصیت کے سلسلے میں وقار ناصری نے اپنے اسی مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک تحریر بھی شامل کی ہے جس سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ ناصری کا مرتبہ کتنا بلند تھا۔شمس الرحمان فاروقی نے تحریر کیا ہے کہ:

''پروفیسر ناصری بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں الہ آباد یونیورسٹی کے ان نامور اساتذہ میں تھے جن کی شہرت نے الہ آباد یونیورسٹی کی شہرت قائم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ناصری صاحب اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے اور شعرفہم بھی تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں میں اردو فارسی کا صحیح ذوق پیدا کیا اور ایسی مستحکم روایت قائم کی جس کے کچھ آثار اب تک باقی ہیں۔افسوس ہے کہ زمانے کے بحران کے ساتھ ناصری صاحب کا نام ہی رہ گیا اور ان کے بارے کوئی تصنیف سامنے نہیں آئی۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے کہ جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جب تک ناصری حیات رہے ایک زمانہ ان کا معترف رہا مگر ان کے انتقال کے بعد پتہ نہیں کیوں ان کا نام غائب ہوتا چلا گیا۔''

اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وقار ناصری تحریر کرتے ہیں:

''ان کے شاگردوں میں بھی سوائے ڈاکٹر اعجاز حسین کے کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ انہیں اس طرح یاد کرتا جس طرح یاد کرنا چاہئے تھا۔''

اپنے اسی مضمون میں وقار ناصری نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ:

''اس کتاب سے پہلے ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی کی کتاب شیخ مہدی حسین ناصری ایک فراموش صاحب کمال شائع ہوچکی ہے۔''

اس کتاب کو چھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں سنہ 1885 سے 1931 تک کے لکھنؤ کے ادبی ماحول کا تذکرہ ہے چونکہ ناصری اس دور میں شامل ہیں لہٰذا ان کو بھی اس میں شمار کیا گیا ہے ۔لکھنؤ اسکول کی مخصوص روایات اور ناصری کی ان سے وابستگی کے تحت ناسخؔ، رشکؔ، میر عشقؔ، آتشؔ، اسیرؔ، جلالؔ اور ناصریؔ کے سلسلے میں تفصیل

سے ان کوششوں کو اجاگر کیا گیا ہے جس نے اردو زبان کو باقاعدہ اصلاح اور لسانی تشکیل کر اس منزل تک پہنچا دیا جہاں سے دبستان لکھنؤ دبستان دلی سے الگ ہو کر آپ اپنی شناخت بن بیٹھا۔ اس سلسلے میں وقار ناصری تحریر کرتے ہیں کہ 1985 سے 1931 تک کا زمانہ گو مختصر سہی مگر ان چند برسوں میں ناصریؔ نے اس روایت کو قائم رکھا جو رشیدؔ کے وسیلے ناسخ تک پہنچتی تھی۔ ''وہ لکھنؤ کی اس شعری روایت کے ترجمان تھے جو بدلتے وقت کے ساتھ خود کو بدلنا چاہتا تھا مگر روایت کی پاسداری بھی مقصود تھی''

اساتذہ لکھنؤ کا ذکر بھی کرتے ہیں جن سے ناصری کے مراسم تھے مشاعروں اور مقاصدوں میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں مرزا محمد جعفر اوجؔ، سید محمد مصطفیٰ عرف لڈن صاحب خورشید، صفی، عزیز، ثاقب، محشر لکھنوی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، بیخود موہانی، یگانہ چنگیزی کا ذکر ہے اور اس بات کو اجاگر کیا گیا ہے کہ ان حضرات سے ناصری کے تعلقات اور روابط کس طرح کے تھے۔ شاگردان ناصری کے سلسلے میں وقار ناصری تحریر کرتے ہیں کہ:

''ناصری کے شاگردوں میں ایک طرف وہ طالب علم ہیں جو الٰہ آباد سے علی گڑھ تک ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے ان کی تعداد بتانا تو آسان نہیں مگر ان میں چند طالب علم ایسے ہیں جو بہت مشہور ہوئے۔ وامقؔ جونپوری، چودھری سید علی محمد زیدی، اے بی نقوی، راجہ احمد علی خان آف سلیم پور، آل احمد سرور، ڈاکٹر عابد حسین۔ محمد مرتضیٰ تو محض چند نام ہیں ورنہ ایسے طالب علموں کی طویل فہرست ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو شاعری میں ان کے شاگرد ہوئے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ فراقؔ گورکھپوری، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، اعجاز حسین خان اعجاز دریاآبادی شاعری میں ناصری کے شاگرد ہیں۔

فراق اور ڈاکٹر اعجاز حسین کو ناصری نے پڑھایا بھی تھا۔ وہ بی اے میں ان کے شاگرد تھے۔''

وقار ناصری نے غلط فہمیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنف ناصری کی پیدائش، ملازمتیں، معلمین، شادی اور اداروں کا تفصیلی ذکر ہے۔ اسی کے ساتھ بحیثیت معلم ان کی خدمات، الٰہ آباد کا ان کا قیام، اس زمانے کے احباب، آخری ایام، بیماری اور وفات کے سلسلے میں تمام اطلاعات بہم کرائی گئی ہیں۔ ناصری اور سید مسعود حسن رضوی کے ہم جماعت والے ڈاکٹر نیر مسعود کے بیان کے سلسلے میں وقار رقم طراز ہیں کہ:

''میرے خیال میں ڈاکٹر نیر مسعود کا بیان حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ ناصری نے چودہ سال کے سن یعنی 1899 میں مڈل کا امتحان حسین آباد ہائی اسکول سے پاس کیا۔ 1901 میں پنجاب یونیورسٹی سے انٹرنس کیا اور 1910 میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے پرائیویٹ انٹرمیڈیٹ کیا۔ اس لحاظ سے ناصری اور مسعود حسن رضوی کا ہم جماعت ہونا مشکوک ہے۔''

ناصری کے معلمین سید محمد رضا فلسفی، مولوی شیخ فدا حسین، مولوی ظہور الحسن قبلہ، ناصر الملت مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ، جسٹس کرامت حسین وغیرہ کا بہت ہی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل

نہیں کہ اگر یہ ذی علم اساتذہ، ناصری کی تعلیم پر توجہ نہ دیتے اوران پر شفقت نہ فرماتے تو شاید ناصری کو وہ علم حاصل نہ ہوتا جس کی بنا پر ان کو شہرت نصیب ہوئی۔ ناصری کے قیام الہ آباد اور وہاں کے ان کے دوستوں کا تفصیل سے ذکر اور ان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے وقار ناصری لکھتے ہیں کہ:

''ملازمت کے سلسلے میں ناصری کا جو زمانہ الہ آباد میں گزرا وہ ان کی زندگی کا سب سے زریں دور تھا ایسا دور ان کی زندگی میں پھر کبھی نہیں آیا۔''

یہی وجہ ہے کہ ناصری کا تعلق الہ آباد سے مرتے مرتے بھی رہا۔ وہ الہ آباد سے واپس آنے کے بعد بھی کسی نہ کسی تقریب کے بہانے الہ آباد آتے رہتے تھے۔ ناصری کے لہ آباد کے دوستوں میں اکبرالہ آبادی، خان بہادر میر علی عباد نیساں، سید ضامن علی ضامن، امرناتھ جھا کے نام قابل ذکر ہیں۔ ویسے تو الہ آباد کا کوئی شاعر اور ادیب ایسا نہ تھا۔ جس سے ناصری کے قریبی مراسم نہ رہے ہوں۔

وقار ناصری نے ان تمام غلط بیانیوں اور تحریروں کا پورے سیاق وسباق کے ساتھ وہ جواب دیا ہے جو نذر احباب کی اشاعت کے حوالے سے تھیں، وہ نذر احباب کے حصہ اول میں ہیں۔ غیر مطبوعہ کلام میں چند فارسی قطعات اور چند رباعیاں ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ناصری کی نثری تخلیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ناصری نے نثر میں بھی کافی سرمایہ چھوڑا ہے۔ نثری کتابوں کی تعداد چھ ہے جو تراجم و تالیفات پر مشتمل ہیں۔ یہ اس زمانے سے شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں جب وہ طالب علم تھے۔ طالب علمی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کی کتابوں کے نام ہیں۔ سردار نبیا، حرارت، زینت و جشن و طیرہ، سرگزشت منصور، مخزن الفوائد، صنادید عجم۔ نثر کے میدان میں ناصری نے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی تحریر کیے ہیں جو اس وقت کے رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں قصائد شمس اور عرب اور سائنس نامی مضامین شامل ہیں۔

''حرف آخر'' کے عنوان سے کتاب کا آخری مضمون ہے۔ اس مضمون میں وقار ناصری تحریر کرتے ہیں:

''مجموعی اعتبار سے جب ہم ناصری کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک مختصر زندگی میں ناصری نے وہ سارے کارنامے انجام دے دیئے جس کے لیے زندگی کے کئی سفر درکار ہوتے ہیں۔ محض 46 سالہ زندگی اور دو زبانوں میں نہیں سات زبانوں کے علم پر عبور حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شاعری میں نام پیدا کرنا، نثر نگاری و مترجم ہونے کے ساتھ ماہر تعلیم ہونا ان کے دوسرے کارنامے ہیں جو ان کی زندگی کے ساتھ جڑے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسی تعلیمی کمیٹی ہو جس کے ناصری ممبر نہ رہے ہوں۔''

وقار ناصری نے بہت صاف گوئی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

''مجھے تو تحقیق کے بہانے اس ناصری کی تلاش تھی جسے تلاش کرنا گویا خود کو تلاش کرنا تھا۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں نے ناصری کو تلاش کر لیا اور اس تلاش میں جو کچھ پایا اور جہاں سے پایا اسے اس صورت میں پیش کر دیا۔ اب اس سے آگے کی منزل ان محققین کی ہے کسی بھی تحقیق کو حرف آخر

نہیں سمجھتے۔ میری تحقیق بھی حرف آخر نہیں ہے کیونکہ ابھی ناصری کی بہت سی تحریریں اور واقعات جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں انہیں تلاش کر کے مزید تحقیق کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔''

ناصری کے استاد پیارے صاحب رشید کے سلسلے میں تفصیلی ذکر کیا ہے کہ ناصری نے جب شعروسخن کی طرف توجہ کی تو اس وقت لکھنؤ میں پیارے صاحب رشید جیسا باکمال استاد موجود تھا۔ ناصری نے انیس سال کی عمر میں پیارے صاحب رشید کی شاگردی اختیار کی۔ ناصری اپنے استاد کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور ایک لائق شاگرد کی طرح اس توجہ کے طالب رہتے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ناصری نے اپنے استاد رشید کی ایسی خدمت کی جو کوئی دوسرا شاگرد نہ کر سکا۔ اگر ناصری یہ خدمت انجام نہ دیتے تو رشید کا بیش قیمتی سرمایہ منظر عام پر نہ آتا۔

ناصری کا دیوان نذر احباب کا حصہ اول زیادہ تر ان غزلیات پر مشتمل ہے جسے ان کا ابتدائی کلام کہا جاسکتا ہے اور جس پر ان کے استاد رشید کی اصلاح ہے۔ دوسرا حصہ ان غزلیات پر مشتمل ہے جو استاد کے وفات کے بعد کہی گئیں۔ اس دیوان میں شامل تقریباً تمام غزلوں پر تاریخیں درج ہیں۔ اس ضمن میں ناصری کی غزل گوئی اور اس کی خصوصیت پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ناصری صرف غزل گو ہی نہ تھے انہوں نے غزلوں کی طرح نظمیں بھی کہیں ہیں وہ نظم کہنے پر قادر تھے اس ضمن میں ان کی ایک مختصر نظم موازنۂ میر و غالب کو مثال کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ناصری کے کلام کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور جو نتیجہ برآمد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

''ناصری، ناسخ و آتش جیسے بہت بڑے شاعر نہیں تھے مگر اعلیٰ درجے کے شاعر تھے ان کا شمار اپنے عہد کے ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔ ان کے لئے تو اتنا ہی اعزاز بہت ہے کہ انہیں اس صنف میں جگہ دی گئی جس کے مستحق تھے۔''

اردو شاعری کا کوئی دور ایسا نہیں جس میں مذہبی شاعری نہ کی گئی ہو۔ ناصری کی طالب علمی کا آغاز مذہبی تعلیم سے ہوا تھا۔ وہ بہترین ذاکر اور خطیب تھے۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ ناصری نے قصائد بھی کہے۔ نمونے کے طور پر دو قصیدے شامل کیے گئے ہیں۔ قصائد کے علاوہ ناصری کے دیوان میں شامل رباعیوں میں زیادہ تر پیری اور جوانی کے وہی مضامین ہیں جو نظم ہوتے چلے آرہے ہیں۔

ناصری کے فارسی کلام کے سلسلے میں وقار ناصری تحریر کرتے ہیں کہ:

''ناصری نے فارسی دیوان پہلے مرتب کیا تھا لیکن اس کے چوری ہو جانے کی وجہ سے وہ اسے پھر مرتب نہ کر سکے۔''

پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ایک کتاب نہیں بلکہ دستاویز ہے جس میں پروفیسر مہدی حسین ناصری کے حوالے سے ان کے عہد کی ادبی تاریخ کو قلم بند کر کے نئی نسل کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وقار ناصری نے حق بات کے اعتراف اور غلط بات کو رد کرنے میں پوری بے باکی کا ثبوت دیا ہے۔ بلا شبہ کہ یہ کتاب ناصری شناسی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

❑❑❑

ڈاکٹر بدؔر محمدی
ویشالی، بہار-Mob.9939311612

غزل

یوں دمِ صبح نگہ گل پہ جھکا لیتا ہوں
اوس کی بوند میں پلکوں سے اٹھا لیتا ہوں

سانس کو ہونے نہیں دیتا میں مقروضِ فضا
کچھ جو لوٹانے کو لیتا ہوں تو کیا لیتا ہوں

خرچ ہوتی ہی نہیں یادِ صنم کی دولت
روز کی پوری کمائی میں بچا لیتا ہوں

چاند جس رات نہیں ہوتا فلک یا چھت پر
اک دیا اس کے تصور کا جلا لیتا ہوں

دخترِ وقت نے بیمار کیا ہے مجھ کو
سو میں انگور کی بیٹی سے دوا لیتا ہوں

کیا بتاؤں کہ دیا رنج بتوں نے کتنا
اب تو ہر بات پہ میں نامِ خدا لیتا ہوں

بدؔر ہے لائق تحسیں مرا ہر اک مصرع
داد لیتا ہوں اگر میں تو بجا لیتا ہوں

●●●

وارث رفیع
سول لائن، بدایوں

غزل

جنونِ عشق کو پُر اشتعال کس نے کیا
تمام اہل جنوں کا یہ حال کس نے کیا

جدیدیت کا مخالف تو میں نہیں لیکن
روایتوں کو میاں پائمال کس نے کیا

تمام اہل خرد کو دکھا کے راہِ نجات
نفس میں جہل کو روشن خیال کس نے کیا

ہوا ہے فرض جو حق العباد دنیا میں
کوئی بتائے یہ کارِ مثال کس نے کیا

تری تمازتِ پُر رعب کیا ہوئی سورج
ترا وجود سپردِ زوال کس نے کیا

وہ کون تھا کہ مزائل بشر کہا جس کو
سوا کلام کے ایسا کمال کس نے کیا

عجب ہے بزم تکلم مری سمجھ سے بعید
جواب کس کو دوں وارثؔ سوال کس نے کیا

●●●

ڈاکٹر غلام حسین

صدر شعبۂ اردو

گورنمنٹ مادھو کالج، اُجین (ایم پی)

موبائل نمبر:9893853183

جدید اردو شاعری میں محمد علوی کا مقام

اردو زبان کی تشکیل و تعمیر اور ارتقاء میں خطۂ گجرات کی جو خدمات رہی ہیں اس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ دور قدیم سے ہی اردو کی جڑیں یہاں عوام میں مضبوط ہوئیں۔اردو کی ابتدائی شکل جسے عرف عام میں گجری کہا جاتا ہے اسی سرزمین میں سرسبز و شاداب ہوئی۔اسی زبان میں شاہ باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی اور خوب محمد چشتی جیسے معماران زبان، تاریخ ساز صوفی شعرائے کرام نے گجری کے توسط سے اردو زبان کو مقبول عام بنانے میں جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ یادگار زمانہ ہیں۔اردو غزل کے باوا آدم ولی کا تعلق خاطر اس خطہ سے بھی ہے۔محمد علوی کی کلیات کے مرتب نے اپنے پیش لفظ میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ محمد علوی کی نسبت اسی خانوادے سے ہے۔اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

"گجرات ہی سے ولؔی گجراتی جیسا شاعر پیدا ہوا جس کا نسبی تعلق حضرت شاہ وجیہ الدینؒ علوی الحسینی الگجراتی سے تھا جو اپنے وقت کے ایک بڑے عالم اور خدا رسیدہ بزرگ تھے اور جن کا مزار احمد آباد کے نہرو پل کے مشرقی سرے پر خان پور سید واڑہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔اسی محلّہ میں علویوں کے چند پرانے خاندان آباد ہیں۔محمد علوی کا تعلق حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے گدی نشینوں کے خاندان سے ہے۔ان کے بڑے بھائی سید احمد علوی درگاہ شریف کے حالیہ سجادہ نشین ہیں۔"

(پیش لفظ، ہسو بھائی یا گنک، ایڈیشن 1995)

یہ گھرانا اپنے تبحر علمی کی بناء پر فخر روزگار رہا ہے۔فی زمانہ اردو ادب میں وارثؔ علوی، محمدؔ علوی اور مظہرؔ الحق علوی کا شمار نامور ادبی ہستیوں میں ہوتا ہے۔گو کہ یہ برادران ہم شیر نہ سہی ہم رشتہ ضرور ہیں۔ان حضرات کی شہرت اور علمیت کی بناء پر معروف مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے علی برادران کی مطابقت میں یہ بلیغ جملہ اختراع کیا ہے۔"ہندستان کی سیاست میں علی برادران کو جو شہرت حاصل ہوئی وہی شہرت ان دنوں اردو ادب میں علوی برادران کو حاصل ہے۔"

متذکرہ برگزیدہ تبار میں محمد علوی 10 اپریل 1927ء کو احمد آباد میں تولد ہوئے اپنے متعلق وہ فرماتے ہیں

پتہ نام چاہو تو لکھ لو میاں
مرا نام علوی ہے گجراتی چھوں
نام علوی ہے غزل کہتا ہوں
احمدآباد نگر ہے میرا

گہوارۂ علم ومعرفت میں انھوں نے آنکھیں کھولیں حسب روایت ان کی تعلیم کا معقول بندوبست ہوا۔اس وقت ہر ہندستانی کا دل حب الوطنی سے سرشار تھا۔چنانچہ محبّ وطن حضرات اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت وطن پرست درس گاہوں میں دلانا چاہتے تھے اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ قومی تعلیم کی حیثیت سے مینارۂ نور تھا۔ایسے کردار ساز ادارہ میں انھیں تحصیل علم کے لئے بھیجا گیا۔لیکن ناگزیر وجوہ کی بنا پر وہاں سے وہ گریز پا ہوئے اور تعلیم ترک کی مگر ذاتی مطالعہ اور طبیعت کی موزونیت سے شاعری کے میدان میں وہ اپنی محنت پیہم اور ریاضت کو اپنا رہنما و رہبر بنائے رہے----اردو ادب کی تاریخ میں بہت سے شعرا کو اس عمل سے دوچار ہونا پڑا کیفی اعظمی اور علی سردار جعفری کو سلطان المدارس لکھنؤ کا سخت گیر ماحول راس نہیں آیا اور مجروح سلطان پوری کا کنزالعلوم ٹانڈہ سے واقعۂ مفرور بھی مشہور ہے لیکن با توفیق خداوندی جب یہ نابغۂ روزگار ہستیاں بحر ادب میں غوطہ زن ہوتی ہیں تو بے بہا آب دار گوہر لے کر نمودار ہوتی ہیں۔اس سے خزینۂ ادب کو معمور کر دیتی ہیں۔----محمد علوی کے عنفوان شباب میں احمد آباد کو اردو شعر و ادب میں خاص مقام حاصل تھا۔ترقی پسندی کے انقلاب پرور ماحول میں شاعری بام عروج پر تھی۔جنگ آزادی کی لے تیز سے تیز تر ہو رہی تھی تصوف کے آستانہ سے صدائے حق بلند ہو رہی تھی۔شاعر رومان وشاعر شباب اختر شیرانی کی سخنوری سے اردو شاعری کو موج زندگی عطا ہو رہی تھی۔ایسے ماحول میں علوی نے متوازن اور مستحکم قدم ادب کے میدان میں رکھا۔محمد علوی کے ابتدائی تشکیلی دور میں قیام ممبئی کا اہم کردار رہا ہے۔اس وقت ترقی پسند تحریک سے ان کی دلچسپی خاصی تھی اور وہ کافی عرصہ تک اس سے وابستہ بھی رہے وہ اس تحریک کے جلسوں اور کانفرنسوں کے بحث ومباحثوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے۔رامانند ساگر کے ناول ''اور انسان مرگیا'' پر جب خواجہ احمد عباس نے دیباچہ لکھا تو اس پر گرما گرم بحث ہوئی اس مباحثہ میں محمد علوی بھی شریک ہوئے۔قرین قیاس ہے کہ اسی دوران وہ میدان ادب میں وارد ہوئے ہوں گے۔سب سے پہلے انھوں نے ایک افسانہ ''جھیری'' لکھا جو 1948 میں ''شاہد'' رسالہ میں شائع ہوا۔اس کے مدیر عادل رشید تھے۔

اسی دوران ان کے اشعار بھی شائع ہونے لگے فلمی دنیا میں شاعروں اور ادیبوں کی بڑی دھوم تھی۔عموماً شاعروں کی اس دنیا میں رسائی کامیابی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ممکن ہے محمد علوی نے بھی کوشش کی ہو مگر یہ امر محتاج ثبوت ہے۔بیسویں صدی انقلابات ، ایجادات اور تحریکات کی صدی رہی ہے۔پہلی اور دوسری جنگ عظیم اسی صدی میں وقوع پذیر ہوئیں۔ انقلاب روس نے اسی صدی کے اوائل میں کمیونزم کا خواب دیکھا اور بہت سے ممالک میں اس نظام کو بروئے کار بھی لایا

گیا۔مگر پوری دنیا میں یہ نظام شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا بعض ممالک ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے خانہ جنگی، مذہبی، لسانی اور علاقائی تصادم سے تشتت و انتشار کا بازار گرم ہوا۔ برسوں کے عمرانی سانچے شکست و ریخت سے دوچار ہوئے۔ تقسیم ہند کا سانحہ سوہانِ روح بن گیا۔آج بھی اس کی ٹیس باقی ہے۔اس موضوع پر ادیبوں اور شاعروں نے اظہارِ غم کا انبار لگا دیا۔محمد علوی کا ''خالی مکان'' اسی کوائف کا آئینہ دار ہے۔یہ شعری مجموعہ 1962ء میں شائع ہوا جسے جدیدیت کا باقاعدہ مجموعۂ کلام قرار دیا گیا۔اس سے پہلے کا جو کچھ ان کا شعری سرمایہ تھا اسے دریا برد کر دیا گیا۔اگر وہ سرمایہ منظرِ عام پر آجاتا تو محمد علوی کے شعری محاسن اور تعین قدر پر گفتگو اور آسان ہو جاتی۔خیر ''خالی مکان'' محمد علوی کی معرکہ آرا تخلیق ہے جسے جدیدیت میں تقدم زمانی کے لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔انھوں نے یاس و حرماں کا دریا بہا دیا ہے اور ایسی فضا متشکل کی ہے کہ لفظ لفظ سے کرب کی ٹیس سنائی دیتی ہے اور مایوسی اور حسرت مترشح ہوتی ہے۔خالی مکان نظم میں فسادات کے بعد آبادیات کی کیفیت ملاحظہ کیجیے ؎

جالے تنے ہوئے ہیں گھر میں کوئی نہیں
''کوئی نہیں'' اک اک کونا چلاتا ہے
دیواریں اٹھ کر کہتی ہیں ''کوئی نہیں''
''کوئی نہیں'' دروازہ شور مچاتا ہے
کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں لیکن
کوئی مجھے اس گھر میں روز بلاتا ہے
روز یہاں میں آتا ہوں ہر روز کوئی
میرے کان میں چپکے سے کہہ جاتا ہے
''کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں پگلے
کس سے ملنے روز یہاں تو آتا ہے''

رات کا منظر دیکھیے ؎

ہائے یہ رات تو افسردہ کیے دیتی ہے
یہ ہوا اور بھی پژمردہ کیے دیتی ہے
سرد جھونکوں سے خیالات بکھر جاتے ہیں
تیر ہی تیر ہیں جو دل میں اتر جاتے ہیں
نیند آتی ہے، کھلی آنکھ سے ڈر جاتی ہے
سہمی سہمی ہوئی چپ چاپ گزر جاتی ہے
خامشی گھومتی رہتی ہے گلی کوچوں میں
تیرگی جھومتی رہتی ہے گلی کوچوں میں
چاند تاروں کے شکنجے میں پڑا رہتا ہے
نیم کا پیڑ اکیلا ہی کھڑا رہتا ہے
چیخ اٹھتا ہے پرندہ کوئی سوتے سوتے
صبح کر دیتی ہے شبنم یوں ہی روتے روتے

تقسیم وطن کے بعد فسادات اک آگ کا دریا بن گئے تھے جسے انسانیت نے ڈوب کر عبور کیا ہے۔کربلا کے بعد یہ انسانیت سوز واقعہ تھا اس حادثۂ فاجعہ کو لوگ برداشت نہ کر سکے کسی کا دل بیٹھ گیا کسی کا دل ٹوٹ گیا اور تو کچھ ناگفتہ بہ حالات سے مختل الحواس ہو گئے۔ادیبوں اور شاعروں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''سکینہ'' جیسے

کرداروں کو کون بھول سکتا ہے۔محمد علوی نے بھی ایک لافانی نظم ''پاگل لڑکی''، لکھی ہے جس میں اس لڑکی کی نفسیاتی کیفیت کو بڑی ہنرمندی سے اجاگر کیا ہے۔

لوگوں کے سایہ سے ڈرتی رہتی ہے
اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی ہے
ہنستی ہے تو پہروں چپ ہوتی ہی نہیں
ورنہ دن بھر آہیں بھرتی رہتی ہے
راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے لگتی ہے
دن میں بیٹھے بیٹھے سونے لگتی ہے
میلے کپڑے تہہ کر کے رکھ دیتی ہے
دھلے دھلائے کپڑے دھونے لگتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی راکھ کریدا کرتی ہے
چولہے میں چنگاری ڈھونڈا کرتی ہے
آنگن میں بیٹھی رہتی ہے نیم تلے
شاخوں پر چڑیوں کو دیکھا کرتی ہے

آئے دن دنگے وفسادات ہوتے رہتے ہیں بستے بستے جو بستیاں بستی ہیں وہ آنِ واحد میں نذر آتش ہو جاتی ہیں۔آج کا انسان خوف و ہراس کا شکار ہے اس کرب کو وہ اپنے اشعار میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

قدم قدم پر فساد برپا
جگہ جگہ چاہتیں شکستہ

مجھے یہ دکھ ہے کہ میں نے یہ گھر بنایا کیوں
یہ گھر ہے آگ کی لپٹوں میں اور میں گھر میں ہوں

بھاگلپور میں جب فساد ہوتا ہے تو ایک حساس شاعر کا دل کیسے تڑپ اٹھتا ہے اور وہ کس انداز سے اظہار اپنائیت کرتا ہے۔

بہت ہی دور تھا مجھ سے بھاگلپور
پھر بھی میں ایک ایک گلی میں
خون سے لت پت پڑا ہوا تھا!
ایک اک گھر میں گھر والوں کے ساتھ جلا تھا
کٹی پھٹی
اور جلی ننگی لاشوں میں
مری تلاش بھی تھی
ڈھونڈھ رہا تھا میں اپنوں کو
مجھ کو مری تلاش بھی تھی!!!

چھ سال کے وقفہ کے بعد ان کا ایک اور مجموعۂ کلام 1968ء میں ''آخری دن کی تلاش''، منظر عام پر آیا لیکن اس میں ''خالی مکان'' کی سی بات نہیں بلکہ اس میں منفی تبدیلی ہے جس کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی نے ''آخری دن کی تلاش'' کے پیش لفظ میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

''خالی مکان'' سے آخری دن کی تلاش میں زمانی فصل کے علاوہ ایک بہت گہرا اور وسیع نفسیاتی بعد ہے اگرچہ لہجہ اور رویہ کی تازگی اب بھی زیادہ تر برقرار ہے لیکن وہ معصوم البیلا پن وہ غیر شعوری عرفان و وجدان وہ ہلکا طربیہ وحزنیہ ملا ہوا بے تکلف انداز گفتگو یہ سب آخری دن کی تلاش سے تقریباً مفقود ہو چکے ہیں۔''

ترقی پسند تحریک کے شروعاتی دور میں ''حلقہ ارباب ذوق'' کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی۔اُس دور کے شعراء وادبا اپنے اپنے میلانات طبع کے تحت دونوں تحریکوں سے وابستہ تھے مگر کچھ دن کے بعد جدیدیت کے پیشواؤں اور پرستاروں نے ترقی پسند تحریک کی موت کا اعلان کردیا مگر حقیت یہ ہے کہ اس وقت ترقی پسند تحریک سے وابستہ فن کار اپنی تخلیقات کو بڑی شد و مد سے پیش کر رہے تھے اور ترقی پسند نقاد اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کر رہے تھے اس سلسلے میں احتشام حسین کا ایک مضمون ''نئے تیشے نئے کوہ کن''،''شب خون'' کے جون 1966 کے شمارے میں شائع ہوا۔اس میں جدید شاعروں کے متعلق بعض سوالات اٹھائے گئے تھے۔جدید شاعری کے چند روشن پہلوؤں کو سراہا گیا تھا اور اس کی بعض کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی تھی خاص طور سے ابہام،اشکال اور اہمال کے مسئلہ کو چھیڑا گیا تھا جس کی وجہ سے نئی شاعری ترسیل کی ناکامی کا شکار ہو رہی تھی۔ترقی پسندوں کے سامنے سماجی اصلاح کے مقاصد تھے جو اپنے منشور کے تحت پورا کرنا چاہتے تھے۔اس کے برعکس جدیدیت محض ترقی پسندوں کے مخالفت کے طور پر ابھری اس لئے اس کے پاس کوئی اور ایسا لائحہ عمل نہیں تھا جو سماجی اصلاح کا دعویٰ پیش کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے متعلق قلم کاروں نے سماجی اور اجتماعی زندگی سے دور کر کے انفرادی آزادی مسائل کی جانب توجہ دینی شروع کردی اور اسی وجہ سے ترقی پسندوں نے انہیں ذات کے خول میں گھرا قلم کار سمجھتے ہوئے انہیں نظر انداز کردیا۔اس تصادم کی شروعات اندور کی ایک ادبی نشست سے ہوئی اور ''شب خون'' نے اسے خوب مشتہر کیا۔احتشام حسین اور عمیقؔ حنفی میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی اس کا اثر پوری ادبی دنیا پر پڑا اور لفظ ''جدیدیت'' کا استعمال ہونے لگا۔چونکہ جدید نظریات میں شعر وادب کا نہ تو کوئی منشور تھا نہ واضح مقاصد وتصور اس لئے اس تحریک سے وابستہ فنکاروں نے اپنے اپنے طور پر جدیدیت کی جہتوں کا تعین کرنا شروع کردیا جس سے یہ تحریک منتشر ہوگئی۔پھر گریز کا سلسلہ شروع ہوگیا۔جدیدیت کو جس زور وشور سے ابھارا گیا تھا اسی زور و شور سے مدھم پڑتا گیا لیکن اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ترقی پسندی میں جو ایک تعطل کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوگئی اسی لئے پروفیسر محمد حسن نے جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع (ایکسٹنشن) قرار دیا ہے۔

طویل العمر شاعر محمد علوی جزوقتی شاعر ہیں ان کا ایک مجموعہ جب منظر عام پر آجاتا ہے تو وہ برسوں خاموش رہتے ہیں۔اس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔

ایک غزل اور کہہ لو علویؔ
پھر برسوں تک چپ رہنا ہے

وہ اپنی شاعری کے متعلق کسی مغالطے میں نہیں پڑتے اور نہ تعلّی کی ڈینگ ہانکتے ہیں بلکہ جو حقیقت حال ہے اسی کا اظہار کرتے ہیں۔وہ اپنی شاعری کے متعلق بڑی انکساری سے یہ کہنے میں تذبذب نہیں کرتے۔

ذکراس پری وش کا
شعروشاعری کیسی
بات کرتے ڈرتا ہوں
ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں
اس کا ذکر کرتا ہوں

ان کی تخلیق میں تنقیدی عناصر کی کارفرمائی بھی ہے۔''چوتھا آسمان'' میں انہوں نے خود اپنا پیش لفظ اشعار میں پیش کیا ہے جس سے ان کی شعری ماہیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ جو ہم تم
روز بولتے رہتے ہیں
ان لفظوں کی
مدھم مدھم روشنیوں میں
میں نے اپنے
آس پاس کی چیزوں کو
اور پاس سے
دیکھنے کی کوشش کی ہے

دراصل تجریدیت مصوری کی تحریک ہے اور اسی تناظر میں تجریدی ادب کا مطالعہ کرنا مناسب ہوگا۔جس طرح کیمرے کی ایجاد سے مصوری کی اہمیت اور قدر و قیمت پر بٹا لگ گیا اور مصوروں نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے تجریدی آرٹ کا سہارا لیا۔قرین قیاس ہے کہ فلم ،ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ کی ایجادات سے ادب پر بھی اس طرح کے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ادیبوں نے ان اثرات کی گرفت سے نکلنے اور اپنی شناخت کو برقرار رکھنے کے لئے تجریدیت کا سہارا لیا ہو۔-------تجریدی شاعری ہمارے سامنے آڑی ترچھی لکیروں، گول مٹول دائروں، نامانوس علامتوں اور ذات کی اندرونی تہوں کی ناقابل فہم رویوں کے روپ میں وقوع پذیر ہوتی ہیں جس میں آغاز انجام، ماجرا کا کچھ اتا پتا نہیں چلتا بس فن کار شعور کی رو کے توسط سے اپنی دنیا میں ڈوب کر سراغ زندگی کا پتہ لگاتا ہے۔ انھیں اپنے وجود کے مٹنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اس نئے فلسفۂ وجودیت کا دامن وہ مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں وہ دفتروں میں ہوں یا کچہریوں میں شہروں میں، میلے ٹھیلوں میں وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں مگر جب وہ کچھ کہتے ہیں تو اس قدر مبہم، غیر واضح اور مہمل ہوتا ہے کہ جسے باشعور قاری بھی سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔اس نوع کا علویؔ کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

ایک میلہ سا لگا تھا دل میں
میں اکیلا ہی پھرا کرتا تھا

وہ شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے بلکہ شاعری کے متعلق اپنا تجربہ وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

اٹھارہ سال سے کرتے ہیں شاعری علویؔ
یہ جانتے ہوئے پیشہ یہ ہے ذلیلوں کا

عام طور سے شاعر اپنے احساسات اور جذبات کو متشکل کرنے کے لئے حسی، بصری اور سماعی پیکر تراشی سے کام لیتا ہے۔اگر کوئی شاعر ان تینوں عناصر کا متناسب التزام کرتا ہے تو وہ مقبول عام ہو جاتا ہے۔محمد علوی کی شاعری میں سماعی پیکر تراشی کا پلہ بھاری ہے۔اس لئے قارئین کی بہ نسبت

سامعین ان کے کلام سے زیادہ متاثر اور محظوظ ہوتے تھے۔وہ اپنی آواز اور ڈرامائی لب ولہجہ سے مشاعرے میں چھا جاتے تھے۔قاری ان کی شاعری سے بور ہو جاتا ہے۔اس کا احساس انہیں بھی ہے اس لئے بلا تکلف وہ کہتے ہیں ۔

رات بھر علویؔ کو میں پڑھتا رہا
یار وہ شاعر تو سچ مچ بور تھا

محمد علوی اردو شاعری کی روایت سے یکسر منحرف ہیں۔خواہ وہ طرز بیان ہو یا طرز احساس،لفظیات،تلازمات اوراستعارات میں ان کی تازہ کاری مستحسن ہے۔وہ اردو کو معرب اور مفرس بنانے سے محترز اور بہ مائل مہند ہیں۔ لفظیات،تراکیب واضافت سے عاری ہیں انھیں وجوہ کی بنا پر ان کے یہاں لسانی تونگری،معنی آفرینی اور جلوۂ صدرنگی کمیاب ہے۔ پھر بھی ان کا شمار جدیدیت کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔وہ منیر نیازی،قاضی سلیم،عمیق حنفی محمود ہاشمی،ندا فاضلی،عادل منصوری،اختر الایمان،کمار پاشی وغیرہ کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔محمد علویؔ کا جدید لب ولہجہ اورتازہ ترین فکر واحساس سے معمور شعری سرمایہ رجحانات جدیدیت میں اہم اضافہ ہے۔انھوں نے شعری کاوشات سے اردو شعر وادب کو جدید فکر اور نئی سمت ورفتار سے ہمکنار کیا ہے۔ان کا یہ گمان بے جانہیں ہے ۔

آیا ہے ایک شخص عجب آن بان کا
نقشہ بدل دیا ہے پرانے مکان کا

❑❑❑

تخلیق کاروں سے گذارش

اپنی تخلیقات/نگارشات صفحہ کے ایک طرف ہی لکھیں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔
ای۔میل سے بھیجی ہوئی تخلیقات/نگارشات کی ہارڈ کاپی جس پر آپ کا پتہ اور موبائل نمبر صاف صاف درج ہو، بھیجنے کی زحمت کریں۔
جو تخلیقات کسی وجہ سے شائع نہیں ہوں گی، ان کی واپسی کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہوگی۔
تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام ، شاخ کا نام،آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اتر پردیش اردو اکادمی بچوں کے مزاج ومعیار کے لحاظ سے

ماہنامہ **باغیچہ**

پورے آب وتاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔
۱۔آپ اپنی تخلیقات بھیج کر
۲۔خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر
۳۔بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق بیدار کر کے
اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

ساحلؔ عارفی
وزیر باغ، لکھنؤ-Mob.7800107995

غزل

کسی شاہ سے نہ وزیر سے کبھی پاؤ گے نہ امیر سے
تمہیں چاہیے جو سکونِ دل ملو خانقاہی فقیر سے

کوئی دلکشی، کوئی روشنی، کوئی زندگی، کوئی تازگی
سبھی مانگ کر یہاں لائے ہیں اُسی ایک بدر منیر سے

مری جاں بھی تو مرا نام تو مری صبح تو مری شام تو
ترا ذکر لب پہ ہے دم بدم مجھے خوف کیوں ہو نکیر سے

مری غزلیں حسن سے گفتگو مری غزلیں عشق کی آبرو
مری غزلیں بن گئیں آرزو کیا استفادہ جو میرؔ سے

یہاں دوستوں کی زبان پر کبھی گل کھلیں کبھی خار اُگیں
کبھی پھول اڑاتے وہ چلتے ہیں کبھی جملے چھوڑیں وہ تیر سے

ہے ادب کی آج بھی آبرو جسے کہتے ہیں سبھی لکھنؤ
میں سخن طراز اسی شہر کا ہوں اسی زمیں کے خمیر سے

رہے متحد تو رہا بھلا ہوئے منتشر تو زیاں ہوا
یہی ساحلؔ آج سبق ملا مجھے چیونٹیوں کی لکیر سے

●●●

منظور پروانہؔ
دانش محل امین آباد، لکھنؤ-Mob.9452482159

غزل

وہ ان دنوں نئے خوابوں کی جستجو میں ہے
بھٹکنے پر بھی سرابوں کی جستجو میں ہے

جو رہتا آیا ہے بے رنگ موسموں کے بیچ
سنا ہے اب وہ گلابوں کی جستجو میں ہے

ہے جس کی ایک جھلک کے لئے جہاں مشتاق
وہ خرقہ پوش خطابوں کی جستجو میں ہے

جو پڑھ سکا نہ عبارت صحیفۂ رخ کی
وہ فلسفے کی کتابوں کی جستجو میں ہے

حیات وموت کی نسبت سے سب سوالوں کے
زمانہ کب سے جوابوں کی جستجو میں ہے

زمیں کو کر کے درختوں سے وہ تہی آغوش
برائے سایہ سحابوں کی جستجو میں ہے

جبیں پہ اس کی سیہ کاریاں جھلکنے لگیں
اسی لئے وہ نقابوں کی جستجو میں ہے

●●●

سید غلام عباس ہلوری
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
Mob.9839189414

ایک نابغۂ روزگار شخصیت: شمس الرحمٰن فاروقی

زبان آواز اور الفاظ کا ایسا سنگم ہے جو ہمارے جذبات اور احساسات کو ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ماہرین لسانیات نے زبان کو آٹھ خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس کی ایک شاخ ''ہند یورپی'' کہلاتی ہے۔ ہند یورپی زبان جب ہندوستان میں داخل ہوئی تو ''ہند یورپی'' سے ترقی کرکے ''ہند آریائی'' زبان کہلائی۔ اسی ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء کو ماہرین لسانیات Experts of Linguistic نے تین حصوں میں تقسیم کردیا جسے ہم قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی کے نام سے جانتے ہیں۔ آج ہماری عام طور سے وہ معروف زبان جسے اردو اور ہندی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ جدید ہند آریائی زبانوں سے نکلی ہیں۔ اردو اور ہندی دو بہنیں ہیں جن کو ایک دوسرے سے جدا کردینے پر دونوں زبانوں کی اصلی خوبیاں پھیکی پڑ جاتی ہیں۔ اگر ہندی دو ہے اور سنسکرت کے الفاظ نہ ہوتے تو آج اردو زبان اتنی شیریں نہ ہوتی۔ اردو کو لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا لسانی مزاج مختلف زبانوں سے مانوس اور قریب تر ہے۔ اس زبان کا ہیولا یوں ہی نہیں تیار ہوا بلکہ اس کے پس پشت شعوری اور لاشعوری کاوشیں کارفرما رہی ہیں جس میں فطری ارتقائی عمل سے قطع نظر شعوری عمل کی بات کی جائے تو اس کو پروان چڑھانے میں صوفیوں، سنتوں، بادشاہوں اور عوام کا یکساں کردار رہا ہے۔ ہندوستان کی متعدد ریاستوں کے نوابین اور راجاؤں نے اردو کی خاص کفالت کی جس کے سبب ولؔی، میؔر، سودا، درد، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، انیسؔ، دبیرؔ، چکبستؔ، آنند نرائن ملا، رتن ناتھ سرشار، فراقؔ، پریم چند، کرشن چند، بیدی جیسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے اردو کو مزید ترقی کی راہیں دکھائیں۔

اردو زبان کے فروغ میں تحریکات اور رجحانات کا بڑا حصہ رہا ہے۔ خصوصاً جس وقت 1935 اور 1936 میں ترقی پسند تحریک وجود میں آرہی تھی کسے پتہ تھا کہ جدیدیت کا علمبردار عالم وجود میں آرہا ہے۔ یہ وہی جدیدیت کا علمبردار تھا جسے ادبی دنیا آج شمس الرحمٰن فاروقی کے نام سے جانتی ہے۔ جن کی تعبیر و تفہیم کی کوئی ایک جہت نہیں بلکہ ان کی علمی اور ادبی شخصیت کے بہت سے جہات ہیں۔ جس نہج اور جہت سے ان کا مطالعہ کیا جائے ان کی شخصیت ممتاز اور نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف جدید ذہن کے نقاد ہیں بلکہ فکشن کی دنیا، تاریخ زبان اردو، عروض و بلاغت، ترجمہ نگاری اور لغت

نویسی کے میدان میں بھی ان کی ادبی تخلیقات کو قابل قدر مقام حاصل ہے۔اوران کے ادبی کارناموں کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کو ادبی دنیا میں اصل شہرت ان کی تنقید نگاری کی وجہ سے ملی۔تنقید کے میدان میں فاروقی صاحب کو موضوع بحث لائے بغیر کوئی عالمانہ بحث مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ان کا نام آج ادبی دنیا میں حوالہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

1935 کا زمانہ تھا جب دنیائے ادب کا یہ ستارہ آسمان ادب پر چمکا شمس الرحمٰن فاروقی ضلع پرتاپ گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔فاروقی صاحب کے آباو اجداد ہندوستانی شیوخ، شیخ عبداللہ کی نسل سے ہیں۔فاروقی کے والد کا نام مولوی خلیل الرحمٰن تھا جو اپنے سات بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔فاروقی صاحب کے والد محترم مولوی خلیل الرحمٰن محکمہ تعلیم میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور 1970 میں وظیفہ یاب ہوئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کی ولادت ان کے نانیہال میں ہوئی تھی،ابتدائی تعلیم کے بعد فاروقی صاحب کا داخلہ اعظم گڑھ کے ایک مکتب میں کرا دیا گیا۔ذہین اور محنت کش ہونے کی وجہ سے فاروقی صاحب ہر امتحان میں اول آتے رہے۔مکتب کی تعلیم سے فراغت کے بعد اعظم گڑھ میں ہی درجہ نہم تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ 1968 اور 1969 میں آپ نے گورنمنٹ جبلی کالج گورکھپور سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔مزید تعلیم کے لئے جارج اسلامیہ انٹر کالج میں داخلہ لیا جہاں سے انٹر کے امتحان میں امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیاب ہوئے۔انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد فاروقی نے ''مہارانا پرتاپ کالج گورکھپور'' کا انتخاب کیا جہاں سے انھوں نے اقتصادیات،مغربی فلسفے اور جغرافیہ کی تعلیم حاصل کی۔ 1953 میں بی۔اے کرنے کے بعد فاروقی الٰہ آباد آ گئے اور یہیں سے انھوں نے انگریزی زبان میں ایم۔اے کیا۔ 1955 میں جب فاروقی صاحب نے ایم۔اے پاس کیا اس وقت وہ پوری یونیورسٹی میں اول مقام پر رہے اور دو گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔اسی سال 1955 میں شمس الرحمٰن فاروقی کا تقرر ستیش چندڈگری کالج میں ہو گیا،لیکن جب شبلی کالج اعظم گڑھ نے دعوت دی تو فاروقی صاحب انکار نہیں کر سکے اور 1956 سے سن 1958 تک شبلی کالج میں انگریزی پڑھاتے رہے اور نئی نسل کو سنوارتے رہے۔

شبلی کالج میں ابھی محض دو برس گزرے تھے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے اور باوقار پیشے کے لئے مقابلہ جاتی امتحان۔آئی۔اے۔ایس میں فاروقی صاحب کو کامیابی حاصل ہوئی اور وہ چیف پوسٹ ماسٹر جنرل بہار اور اترپردیش کے عہدے پر فائز ہوئے اور 31 جنوری 1996 کو باوقار طور پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔26 دسمبر 1955 کو شمس الرحمٰن فاروقی کی شادی سرزمین الٰہ آباد کے قصبہ پھول پور کے ایک زمیندار گھرانے میں جمیلہ خاتون سے ہوئی جو الٰہ آباد یونیورسٹی کی باصلاحیت اور ہونہار طالبہ تھیں۔

اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ ایک ذمہ دار، خوش اخلاق اور کنبہ پرور خاتون تھیں۔وہ الہ آباد کے حمیدیہ کالج کی پرنسپل بھی رہیں۔فاروقی صاحب کی دو بیٹیاں مہر افشاں اور باراں رحمٰن ہوئیں، بڑی بیٹی مہر افشاں ورجینیا یونیورسٹی میں درس وتدریس کے لئے منتخب ہوئیں اور چھوٹی بیٹی باراں رحمٰن نے بی۔ایس۔سی کے بعد ایم۔اے انگریزی اور پی۔ایچ۔ڈی کی اور جامعہ ملیہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی بنیادی طور پر ایک بڑے نقاد اور دانشور ہیں۔بیسوی صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں جو نقاد سامنے آئے ان میں شمس الرحمٰن فاروقی کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔فاروقی صاحب کے علمی وادبی سرمایے میں تقریباً چالیس سے زیادہ اردو اور انگریزی کتابیں موجود ہیں جن کو ملک اور بیرون ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ادب کی متعدد اصناف پر اپنے نقوش چھوڑے لیکن جو قبولیت ان کو تنقید کے میدان میں حاصل ہوئی اس نے ان کو نابغۂ روزگار شخصیت کا درجہ عطا کیا کیونکہ ان کی تنقید نگاری جدید ذہن کی روشن کی ہوئی ایسی شمع ہے جو توازن، غیر جانبداری اور فن پارے کی راست تفہیم کا گوشہ کھولتی ہے۔ان کے تنقیدی افکار اور تنقید کرنے کا طریقۂ کار ذہن کو جگمگا دیتا ہے اور فن پارے کو سمجھنے، نقاد کی رائے سے متفق ہونے پر مجبور کر دیتا ہے، ان کے مجموعی تنقیدی عمل میں توازن کو خاص اہمیت حاصل ہے، مشہور ناقد ابوالکلام قاسمی غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع شدہ خصوصی شمارے کے اپنے مضمون ''شمس الرحمٰن فاروقی کی ناقدانہ شناخت کے مسائل'' میں رقمطراز ہیں:

''شمس الرحمان فاروقی نے یوں تو تنقید کے نظری اور اطلاقی پہلوؤں کا توازن اپنی تنقید نگاری کے ہر دور میں کچھ اس طرح قائم رکھا کہ اگر انھوں نے میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ اور دوسرے ممتاز کلاسیکی شاعروں کی تفہیم وتحسین کی کوشش کی وہیں اپنے استعمال کردہ تنقیدی اصولوں اور نظریات کو الٹ پلٹ کر وقتاً فوقتاً دیکھنے اور ان میں توازن پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔انھوں نے کبھی بھی اپنی تنقید میں محض مغربی تنقیدی اصولوں یا محض مشرقی شعریات کو زیادہ غالب نہیں ہونے دیا۔''

(شمس الرحمان فاروقی ادیب ودانشور: مرتبین، سید رضا حیدر، محضر رضا، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔اشاعت 2019، ص 29)

فاروقی صاحب بین الاقوامی طور پر جانے مانے نظریہ ساز، اردو رائٹر، شاعر اور ایڈیٹر مانے جاتے ہیں۔اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھتے رہے ہیں۔فاروقی صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیفات میں (لفظ ومعنی 1968)(شعر غیر شور انگیز 1975)(عروض وآہنگ اور بیان 1977)(تنقیدی افکار 1984)۔''فاروقی کے تبصرے''، و''افسانے کی حمایت میں 1982''۔''اثبات ونفی''، ''انداز گفتگو کیا ہے''، ''اردو غزل کے اہم موڑ'' ہیں۔اس کے علاوہ ''تفہیم غالب'' ''اردو کی نئی کتاب'' اور ''جدیدیت اور ہم'' وغیرہ کتابیں

دنیائے اردو ادب میں حوالے کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔فاروقی صاحب سن 1990 اور 1992 کی مدت کے درمیان اردوغزل کے سب سے بڑے شاعر میر تقی میرؔ کی تعبیر وتفہیم پر اردوادب کی شہرۂ آفاق کتاب ’’شعرشورانگیز‘‘ چار ضخیم جلدوں میں لکھی۔اس کتاب پر فاروقی کو ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ (سرسوتی سمان) ملا۔شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو کے سب سے زیادہ مشہور شاعر مرزا غالبؔ کی تفہیم کے حوالے سے بھی (’’غالب پر چار تحریریں‘‘ اور ’’غالب کے چند پہلو‘‘) مضامین کی صورت میں لکھے جن کو پڑھے بغیر اس دورجدید میں غالبؔ کو سمجھنا بہت مشکل امر ہے۔فاروقی صاحب کی مشہور زمانہ کتاب ’’عروض، آہنگ اور بیان‘‘ عروض وبلاغت سے متعلق معرکہ آرا تصنیف ہے جس میں آپ نے عروض کے عملی اسباق کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے کامیاب افسانے بھی لکھے ہیں،ان کا معروف افسانوی مجموعہ ’’سوار اور دوسرے افسانے‘‘ 2001ء میں شائع ہوا تھا،جس پر ادبی حلقوں سے بڑی داد ملی تھی۔شاعری کے میدان میں بھی فاروقی صاحب پیچھے نہیں رہے۔ان کے شعری مجموعوں میں ’’گنج سوختہ‘‘ ’’سبز اندر سبز‘‘ ’’چار سمت دریا‘‘ اور ’’آسمان محراب‘‘ شاعری کی دنیا میں قابل قدر نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ اردو ناول کی دنیا میں فاروقی صاحب کا ناول ’’کئی چاند تھے سر آسماں‘‘ ایک لازوال ناول ہے،جس پر ادبی دنیا میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔اور جب تک اردو دنیا میں صنف ناول ہے فاروقی کا یہ ناول موضوع بحث بنا رہے گا۔اسی طرح بحیثیت ایڈیٹر بھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔الہ آباد سے شائع ہونے والے رسالہ ’’شب خون‘‘ کو ادبی دنیا میں خاص اہمیت حاصل ہے جس کو جدیدیت کا نمائندہ رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے جس کا سہرا شمس الرحمٰن فاروقی کے سر ہے۔اسی لئے فاروقی صاحب کو جدیدیت کا علمبردار کہا جاتا ہے۔فاروقی صاحب نے ادبی تخلیقات میں کتابوں کے علاوہ مضامین، تراجم،اورشرحیں ادب کو بطور تحفہ عطا کی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی انجمن ترقی اردو ہند کے ممبر جنرل کاؤنسل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ ممبر، ڈائریکٹر بیورو برائے ترقی اردو گورنمنٹ آف انڈیا، غالب اکیڈمی اور فخر الدین اکیڈمی کے فاؤنڈر ممبر، جج ساہتیہ اکیڈمی اور راجستھان اردو اکیڈمی کے ممبر کاؤنسل ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد دیگر اداروں سے وابستہ رہے اور اپنی سماجی وادبی خدمات بخوبی انجام دیتے رہے۔

فاروقی صاحب نے اندرون ملک کے علاوہ امریکہ میں اردو غزل اور افسانے پر منعقدہ کانفرنس، لاہور اور کراچی میں اہم خطبات، کناڈا اور تھائی لینڈ میں اہم مقالے، برطانیہ، نیوزی لینڈ، سنگاپور، جرمنی، ترکی اور دیگر ملکوں میں ملک ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہوئے نہایت معرکہ آرا خطبات کے ذریعہ ادبی خدمات انجام دی ہیں جن کا اس مختصر مضمون میں جائزہ لینا نہایت دشوار عمل ہوگا۔

فاروقی صاحب کو متعدد یونیورسٹی اور علمی اداروں

نے وزیٹنگ پروفیسر کا درجہ دیا تھا جن میں حیدرآباد یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، برٹش کولمبیا یونیورسٹی، سنگاپور یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وغیرہ نہایت اہم ہیں۔اس کے علاوہ مختلف اوقات میں بہت سے اہم اور بڑے اداروں نے فاروقی صاحب کی ادبی خدمات کو اپنا مقدر سمجھا ہے۔

مختصر یہ کہ شمس الرحمٰن فاروقی تقریباً نصف صدی تک اردو کے ادبی، تخلیقی او رتنقیدی منظرنامے پر چھائے رہے ہیں۔انہوں نے تنقید وتحقیق، ناول، افسانہ، شاعری اور ادبی صحافت کے دائرے کو وسیع کیا اور لازوال ادبی سرمایہ چھوڑا۔ان کی اہم خدمات کو سراہتے ہوئے متعدد اہم ایوارڈ، اعزازات اور انعامات وغیرہ سے بھی نوازا گیا جن میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، غالب انسٹیوٹ سے غالب ایوارڈ، اعزاز میر، سرسوتی سمان، علی گڑھ یونیورسٹی سے اعزازی ڈگری ڈی۔لٹ وغیرہ اہم ہیں۔اس کے علاوہ سینکڑوں ادبی ایوارڈ بطور شکرانہ دیئے گئے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی تاحیات علم وادب کی خدمت کرتے رہے اور بالاخر 25 دسمبر 2020 کو اردو ادب کا یہ خدمت گار ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔لیکن جب تک دنیائے ادب زندہ ہے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

□□□

ضیاالدین ضیاؔ خیرآبادی
خیرآباد، سیتاپور-Mob.9580579100

غزل

شوخیٔ حسن ہے مائل بہ جفا ہو جانا
ذوقِ عشاق ہے اس خو پہ فدا ہو جانا

حلقۂ عالم اُلفت میں ہے معراجِ حیات
ڈوب کر عشق کے دریا میں فنا ہو جانا

کیا محبت کا یہ انداز نیا ہے کوئی
باتوں باتوں میں غضب ناک ترا ہو جانا

دُور رہ کر بھی تڑپتا ہے دل اپنوں کے لئے
اتنا آساں نہیں رشتوں کا جدا ہو جانا

بن نہ جائے کہیں گلشن کی تباہی کا سبب
بوئے اخلاص کا پھولوں سے ہَوا ہو جانا

بندۂ حق ہوں میں دنیا ہی نرالی ہے مری
مجھ کو آتا نہیں بندے سے خدا ہو جانا

گھر ہو خالی تو پَسر جاتی ہے خود ویرانی
اس کی یادوں سے تو غافل نہ ضیاؔ ہو جانا

●●●

ڈاکٹر اسلم مرتضیٰ
کاکوری، لکھنؤ-Mob.9559043204

خواتین اودھ کی فکشن نگاری کا مختصر جائزہ

اودھ کی راجدھانی فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد اردو شعر و ادب میں جو نام سب سے نمایاں ہیں، ان میں انشاء اللہ خاں انشاء، شیخ قلندر بخش جرأت اور غلام ہمدانی مصحفی کو اہم مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔ انشاء کی رانی کیتکی کی کہانی اردو زبان کی پہلی کہانی تسلیم کی جاتی ہے اور یہیں سے اودھ میں فکشن نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور محمد بخش مہجور، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین، عبدالحلیم شرر اور مرزا محمد ہادی رسوا تک پہنچتے پہنچتے اردو فکشن نگاری کی فضا کو پوری طرح مستحکم ہوگئی۔

اردو ناول کی ابتدا ہی خواتین کے مسائل اور تعلیم نسواں سے ہوتی ہے، ڈپٹی نذیر احمد کو اردو زبان کا پہلا فکشن نگار اور ان کے ناول مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے، اس ناول میں دو بہنیں اکبری اور اصغری کے کردار کے ذریعہ طبقۂ نسواں میں تعلیم کی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے۔ لڑکیوں میں تعلیم نہ ہونے کے سبب ان میں ذہنی شعور پیدا نہیں ہو پاتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید تحریک سے ہندوستانی فضا میں تبدیلی کے باعث سیاسی اور سماجی مسائل منظر عام پر آئے۔ مشنری اور نسوانی تحریکوں سے لڑکیوں میں تعلیم کا رجحان بڑھنے لگا، اور فکشن نگاری میں خواتین کی توجہ ہوئی۔ رشیدہ النساء کو پہلی خاتون فکشن نگار اور نذر سجاد حیدر کو اردو کے ابتدائی خواتین ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے اس پس منظر میں جب ’’اردو ادب میں خواتین اودھ کی فکشن نگاری‘‘ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو سب سے پہلے اہم نام عصمت چغتائی کا ملتا ہے اگر چہ انہوں نے لکھنؤ میں بہت زیادہ عرصہ نہیں گزارا۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے لکھنؤ کے ازابیلا تھوبرن (آئی ٹی) کالج سے بی اے پاس کیا، یہی وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں منشی پریم چند کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ کے صدارتی خطبہ میں منشی پریم چند نے کہا تھا ’’ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا ہوگا۔‘‘ اسی درمیان لکھنؤ میں عصمت کی ملاقات رشید جہاں سے ہوئی۔ پریم چند اور دیگر بڑے ادیبوں کو انہوں نے بڑے قریب سے دیکھا، اس کا ذکر عصمت نے اپنی آپ بیتی میں اس طرح کیا ہے:

’’لکھنؤ میں گزارے ہوئے دو سال میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوئے دل و دماغ کو نئے

راہیں ملیں۔ نئے دروازے کھلے۔‘‘

رضیہ سجاد ظہیر نے اپنے شوہر سجاد ظہیر کے ساتھ لکھنؤ میں ۶۵۔۱۹۴۷ء قیام کے دوران ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ میں زیادہ تر شاعر و ادیب ہندوستان کی تقسیم سے ہونے والی بربادیوں اور تباہیوں کے سلسلہ میں قوم کو صحیح راہ دکھانے لگے۔ رضیہ نے بھی ہندوستان کی ترقی اور مذہبی اتحاد و اتفاق کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ساتھ ہی لکھنؤ کے کرامت حسین گرلس کالج میں اردو لکچرر کی حیثیت سے بی۔اے درجات میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں بھی عارضی طور پر چھ ماہ لکچرر کی حیثیت سے تعلیم دی۔ رضیہ سجاد ظہیر ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے علاوہ ترجمہ نگاری میں بھی خاص مہارت رکھتی تھیں۔ انھوں نے کئی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے، رضیہ کے ناولوں میں سرشام، سمن، کانٹے اور اللہ میگھ دے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا شمار اردو کی ممتاز خواتین ناول نگاروں میں اس لئے ہوتا ہے کہ انھوں نے فکشن میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ حیدر کی تعلیم لکھنؤ کے آئی ٹی کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوئی اس کا ذکر انھوں نے اپنے ناولوں میں بہت دل کھول کر کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں آخر شب کے ہم سفر اور آگ کا دریا کے ترجمے دوسری زبانوں میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں متعدد انعامات اور اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے بچوں کے رسائل میں بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے بچوں کے پروگرام میں بھی شریک ہوتیں اور اس کے لئے اسکرپٹ بھی لکھتی تھیں۔

مسرور جہاں ۸؍جولائی ۱۹۳۸ء کو ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئیں، انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے واقعات اپنے اردگرد کے ماحول سے لئے ہیں۔ وہ دور جدید کی اہم ناول نگار ہیں، تقریباً ۵۵ ناولیں اور آٹھ سو کے قریب افسانے تخلیق کئے ہیں۔ مسرور جہاں نے اپنی زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزاری۔ ان کے ناولوں میں نئی بستی، درد کے الاؤ کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی کئی تصانیف کو انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔

عطیہ پروین ضلع ہردوئی کے قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئیں، زمینداری کے خاتمہ کے بعد لکھنؤ کے محلّہ ابوتراب خاں میں سکونت اختیار کی۔ ان کے پہلے افسانہ کو رام لعل نے بطور اصلاح دیکھا اور اس افسانہ کا عنوان ’’وہ جارہا ہے کوئی شب غم گزار کے‘‘ رام لعل ہی نے دیا۔ عطیہ پروین نے ۳۲ ناولیں اور بہت سے افسانے لکھے ہیں، ان کے ناولوں میں زیادہ تر مشرقی تہذیب نظر آتی ہے جس کی جھلک ان کے ناول ’’یہ رشتے دل کے‘‘ میں صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

مذکورہ فکشن نگار خواتین کے علاوہ اودھ کی دیگر خواتین نے بھی فکشن کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں مذکورہ خواتین کے ساتھ مندرجہ ذیل خواتین کی فکشن نگاری پر بھی مزید خامہ فرسائی کی جاسکتی ہے، جن میں عائشہ

صدیقی، صبیحہ انور، فرزانہ اعجاز، عبیدہ سمیع الزماں اور ملیحہ سمیع الزماں کے ناولوں اور افسانوں کو بھی موضوع بحث بنایا جا سکتا ہے، کیونکہ ان خاتون ناول نگاروں نے خواتین کے مسائل، دیہی اور شہری زندگی کے تضاد، مذہبی تعصب، مشرقی اور مغربی کلچر اور موجودہ سماجی اور سیاسی اقتدار کو اپنے ناولوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مختصر یہ کہ اردو ادب میں خواتین کی فکشن نگاری کا آغاز انیسویں صدی کی آخری دہائی سے ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی مزید اضافہ نظر آنے لگتا ہے، ترقی پسند تحریک کے اثرات اور تقسیم ہند میں رونما ہونے والے واقعات، سیاسی اور سماجی مسائل، تعلیمی اور تہذیبی زندگی کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش، اس ضمن میں اودھ کے علاقہ میں بھی اردو فکشن نگاری کو مکمل طور پر عروج حاصل ہوا، مردوں کی طرح اودھ کی خواتین نے بھی فکشن نگاری کے میدان میں شانہ بہ شانہ ساتھ دیا جس سے نہ صرف اردو زبان میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ اردو ادب میں نئی تہذیب اور نئے کلچر کا اضافہ ہوا۔ آج بھی اودھ کے خطہ میں آنے والے اضلاع میں لکھنؤ کے علاوہ بارہ بنکی، فیض آباد، سیتاپور، ہردوئی اور رائے بریلی ہیں۔ ان اضلاع کے شہروں کے علاوہ ان کے قصبات سے لے کر دیہات تک اردو فکشن کو بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور لکھا جا رہا ہے۔

❑❑❑

عطیہ پروینؔ
ردولی، ایودھیا-Mob.9696783987

غزل

دنیا کا ظلم کون سا ہم نے سہا نہیں
آئی مگر زباں پہ کوئی بد دعا نہیں

حیران ہوں میں آپ کے اس خط کو دیکھ کر
جس میں سوائے نام کے کچھ بھی لکھا نہیں

پوچھا تھا میں نے توڑ دئے کیوں تعلقات
کوئی جواب آج بھی اس کا ملا نہیں

محفوظ میرے پاس ہیں اس کی نشانیاں
دامن جو پھٹ گیا تھا وہ اب تک سلا نہیں

دست طلب اٹھا تو خدا ہی کے سامنے
دنیا کے سامنے مرا دامن بڑھا نہیں

مٹی، مکان، ماں کے لئے گاؤں میں رہا
یہ نعمتیں وہ چھوڑ وطن سے ہلا نہیں

پروینؔ خوش نصیب ہے اچھا پڑوس ہے
اس کو ہوا کبھی بھی کسی سے گلہ نہیں

●●●

ڈاکٹر روشن آرا

پرولیا،مغربی بنگال-Mob.7908126319

قطعات شہباز امروہوی: ایک مطالعہ

شہبازؔ امروہوی کا اصل نام سلطان احمد صدیقی تھا اور شہباز تخلص۔آپ کی پیدائش ۲۳/جنوری ۱۹۱۰ء کو امروہہ میں ہوئی ،عربی، فارسی اور دینی علوم سے فراغت کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔تقریباً ۱۴/برسوں تک جگدیش سرن ہندو کالج امروہہ میں معلم کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے رہے۔آپ کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ اوائل عمری میں ہی نعمت بصارت سے محروم ہو گئے ۔۱۹۴۲ء میں آنکھوں میں تکلیف شروع ہوئی کافی علاج و معالجہ کے بعد بعد بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔آخر کار ۱۹۴۵ء تک بینائی یکسر چلی گئی۔اس کے باوجود چشم بینا وا ہی رہی ۔شروع میں سنجیدہ شاعری کرتے تھے اور سلطان احمد مسلم تخلص تھا لیکن ۱۹۵۵ء میں قیام بمبئ کے دوران شہباز تخلص اختیار کیا اور طنزیہ و مزاحیہ شاعری کرنے لگے۔اس سلسلے میں وہ خود ہی کہتے ہیں کہ بمبئ کے مختلف رسالوں میں طنزیہ ومزاحیہ شاعری شائع ہوتی تھی لیکن وہ اس معیار کی نہ تھی لہٰذا انھوں نے اس طرح کی شاعری شروع کر دی اور پھر بہت جلد اس میدان میں انھوں نے اپنا لوہا منوا لیا۔ چونکہ شہباز کے سنجیدہ کلام تک میری رسائی نہیں ہو پائی ہے،اس لئے یہ پتہ لگانا مشکل امر ہے کہ سنجیدہ شاعری میں ان کے خواص کیا تھے۔گویا شہباز کا یہ جواز درست ہے یا نہیں اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔اس سلسلے میں جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

’’۱۹۴۵ء میں بصارت سے محروم ہوئے تو اپنی شاعری کا رنگ بدل کر مزاحیہ رنگ اختیار کرلیا۔اس تبدیلی میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ بینا نابینا ہو جائے تو شاید احساس محرومی کا شکار ہو جاتا ہے کمزور اعصاب کا شکار ہوا تو معاشرے سے نفرت کرنے لگتا ہے، حاسد اور مردم بیزار ہو جاتا ہے، باشعور ہوا تو زندہ رہنے کا نیا سلیقہ پیدا کرتا ہے تا کہ بینائی کے بغیر بھی ہر دلعزیز بن کر سارے معاشرے کی آنکھ کا تارا بن جائے۔‘‘

(ط۔ظ۔شہباز امروہوی ص ۵، ۱۹۸۲ء بزم ارباب سخن کراچی)

شہباز بھلے ہی بینائی سے محروم تھے لیکن سماجی و معاشرتی صورت حال ،اقتصادی زبوں حالی، عالمی کرب و انتشار، سماجی بے راہ روی، سیاسی جعلسازی، امرا و ارباب اختیار کی استحصالی خصلت کبھی بھی ان کے چشم باطن سے پوشیدہ نہ رہے۔سماج میں پھیلی برائیوں، ناہمواریوں کو دیکھ کر وہ ہمیشہ کراہتے رہے جس کا سد باب انھوں نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی صورت میں پیش کر دیا۔رئیس امروہوی نے بجا فرمایا ہے:

''تمام شعراء واقعات، جذبات ،تاثرات کو دو آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن طنزگوشاعر کی تیسری آنکھ بھی کھلی ہوتی ہے اور وہ ہر واقعہ، ہر منظر اور خیال کے ایک ایسے پہلو دریافت کر لیتا ہے جس کے ادراک سے دوسرے حضرات محروم رہتے ہیں۔''

(بحوالہ شہباز بلند پرواز مشمولہ آئینۂ شہباز، مدیر اعلیٰ سید امروہوی ص۱۵ بزم ارباب سخن کراچی)

شہباز خلاقانہ ذہن کے مالک تھے۔ان کی شخصیت میں جو نرمی، متانت اور سنجیدگی رچی بسی تھی، اس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی بجا طور پر ہوا ہے۔وہ ذہین، باشعور اور قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی ذہانت، وسعت فکر، گہرائی و گیرائی کا اندازہ ان کی شاعری سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ان کے یہاں طنز میں تیکھا پن، کڑواہٹ و تلملاہٹ کا انداز بالکل بھی ناپید ہے۔البتہ کسک، ہلکی چوٹ، اور ایک طرح کی رحم دلی کے جذبات کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ان کے یہاں طنز و مزاح کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ان کی شاعری کا رنگ کیا ہے اس کا انکشاف ان کے درج ذیل قطعہ سے بآسانی ہوسکتا ہے۔

عیاں ہے سازِ ظرافت سے سوزِ دل میرا
نہاں ہے دل کی لگی، دل لگی کے پردے میں
یہ قہقہے نہیں شہبازؔ میرے نالے ہیں
بہا رہا ہوں میں آنسو ہنسی کے پردے میں

ان کی شاعری میں اسی دردمندی کی نمود ہے اور وہ ہنسی مذاق کے پردے میں دل پر گزرے ہر واقعہ کو رقم کر جاتے ہیں۔انھوں نے خود کو 'دیوارِ قہقہہ'' سے بھی تعبیر کیا ہے لیکن اس دیوار کی بنیاد میں یہی دردمندی اور اصلاحی پہلو موجود ہے۔شہبازؔ کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں۔وہ ہر طرح کے خیال کو کمالِ فن کاری کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہیں انھوں نے سماج و معاشرت کی ہر اس برائی کی گرفت کی ہے جو اس کی کمر توڑ رہی تھی اور سماج و معاشرے میں ایک وبا کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔موضوعات کے تنوع کے ساتھ ان کے یہاں زبان و بیان کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔الفاظ و محاوروں پر انھیں قدرت حاصل ہے اور صنائع و بدائع کو بھی بڑی خوبصورتی سے برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔مزید شائستگی اور بے ساختی بھی ان کے کلام سے عیاں ہے۔

سیاست کے مکر و فریب پر طنز و مزاح کے تیر برسانا تقریباً ہر مزاح نگار کا محبوب مشغلہ ہے۔شہبازؔ نے بھی اپنے قطعات میں اس موضوع کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔ان کے یہاں سیاسی لیڈروں کے مسخ کردار کا قلع قمع کیا گیا ہے۔سیاست پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ ان کی چالوں کو بخوبی سمجھتے تھے اور اپنے قاری کو بھی ان سے آگاہ کرواتے۔ساتھ ہی الیکشن، کرسی، ٹیکس، رشوت، بے روزگاری، بھوک و افلاس پر بھی بھرپور طنز کیا ہے۔نیز سرکاری ارکان کی بے عملی، زر پرستی اور عوام کو یرغمال میں رکھنے کے رجحان پر بھی طنز کیا ہے۔ان کے طنز کا وار بہت شدید ہوتا ہے جو زخم کھاتا ہے تلملا کے رہ جاتا ہے۔سیاسی رہنماؤں پر طنز کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

غرض نکال کے اپنی ہمارے ووٹوں سے
دکھائی دیتے نہیں ہیں مزاج پُرسی کو
خدا تو عرش سے نیچے اتر بھی سکتا ہے
مگر یہ چھوڑ نہیں سکتے اپنی کرسی کو

....

مثل شعر میرؔ و مرزا، فرق آہ و واہ کا
صاف ظاہر ہے ہمارے اوران کے حال میں
واہ پر وہ،عمر میں نوے کے ہیں جو وہ وزیر
آہ یہ ہم، سٹھ گئے جو صرف پچپن سال میں

....

واہ یہ کایا کلپ یہ جاہ و منصب کی ہوس
تیرے منتر سے بدیسی بھی تو دیسی بن گئے
سوٹ تھے ریشم کے کل جن ٹوڈیوں کے جسم پر
آج وہ کھدر پہن کر کانگریسی ہو گئے

....

پوچھا ہم نے دیوتا سے موت کے
راج کے درجے ہیں کے اے پامراج
ہنس کے بولا راج کے ہیں تین نام
سامراج و رام راج و کامراج

....

ان قطعات میں موجود بلیغ اشاروں پرغور کرنے سے ہمیں ایک سیاسی شعور سے کما حقہ واقفیت ہوتی ہے لگ بھگ نوے کی دہائی میں مرارجی دیسائی کے وزیراعظم بننے کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔مزید جواہرلال نہرواور لال بہادرشاستری کے نام کے لفظ'لال' کی یکسانیت کواستعمال کر کے بڑے ماہرانہ انداز میں سیاسی حکمت عملی کو نمایاں کیا ہے۔پھرراجیوگاندھی کی سیاست میں آمد کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔غرض ان باتوں کے علاوہ مخلوط وزارت کی اصلیت،ایوانی کارروائی،سرکاری اہل کاروں کی بدعنوانی، حکومت کی کمزوری،نس بندی،بینکوں کےقومیانے کاعمل، کسانوں کی پامالی وغیرہ جیسے موضوعات پربھی ان کاقلم رواں رہا۔سیاسی موضوعات میں یہ امربھی غورطلب ہے کہ شہبازؔ نہ صرف سیاسی کارکنوں کے اعمال سے خائف ہیں بلکہ وہ عوام کی مفت خوری سے بھی نالاں ہیں۔قطعہ دیکھیں ؎

ووٹر کے پاس جا کے یہ کی میں نے التجا
کونسل کی ممبری کا مجھے ووٹ دیجئے
کہنے لگا کہ ووٹ تو پیچھے کی بات ہے
پہلے تو سیدھی بات ہے کہ نوٹ دیجئے

کسانوں کی زبوں کا یہ نقشہ بھی دیکھتے چلیں ؎

ذرا چوکس رہیں اہل زراعت اپنی فصلوں سے
نکل آئے ہیں ہنسیا لے کے بالی کاٹنے والے
سمجھ لیتے ہیں اپنی ملکیت وہ کشت زاروں کو
یہ ٹڈی دَل کی صورت کھیت کو ہیں چاٹنے والے

رشوت خوری پر طنز کا انداز ملاحظہ ہو ؎

شہبازؔ کلرکوں کے اس انداز کے قرباں
لیتے ہیں عجب شان سے آفس میں یہ رشوت
رکھتے ہیں یہ پاکٹ میں رقم پھیر کے گردن
کہتے ہیں ارے اس کی بھلا کیا تھی ضرورت

شہباز جہاں ایک طرف سیاست کے مکروفریب کو آشکارکرنے میں کامیاب نظرآتے ہیں، وہیں وہ معمولی سے گھریلوموضوعات کوبھی کمال فنکاری سے پیش کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ جہاں ساس بہوکے نازک رشتے کومسمارہونے سے بچانے کے خواہشمند ہیں، وہیں دوسری طرف جہیز کی لعنت سے بھی متنفر ہیں۔سرکاری اداروں کی ابتری کا رونا روتے ہیں،غربا کے جان و مال کی ناقدری پراشک فشانی کرتے ہیں،مزدوروں کی رہنمائی کا دعویٰ کرنے والے کو جب سرمایہ داروں کے محل میں دعوت اڑاتے دیکھتے ہیں تب بھی کڑھتے اوراپنی پیاری زبان اردو کے ساتھ ہورہے ناروا

سلوک کی بھی انہیں فکر ستاتی ہے۔مذہبی بدعتوں کو جس طرح طنز کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، اخلاقی گراوٹ اور قدروں کی پامالی کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔غرض ان کا مجموعۂ کلام ''ط،ظ'' متنوع موضوعات سے مالا مال ہے۔اب رہا سوال کہ وہ ان موضوعات کو برتنے کے لئے فن کی کن کن منزلوں سے گزرتے ہیں اور طنزیہ ومزاحیہ قطعہ نگاری کی آبیاری کن کن ذرائع سے کرتے ہیں۔ان کے قطعات سے زبان و بیان کی دلکشی عیاں ہے وہ تجنیسی مناسبت سے شعر کے لطف کو دوبالا کرنے کا ہنر آزماتے ہیں۔ساتھ ہی رعایت لفظی کے استعمال سے بھی معنوی رفعت پیدا کرتے ہیں۔مزید برآں محاوروں کے برمحل استعمال سے کہیں کہیں ذومعنی کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔

دیہاتی محاوروں کے پرلطف استعمال میں بھی ان کا قلم رواں ہے ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

محفل شعر وسخن میں جب صدائے واہ واہ
چھت اڑا کر گنبد گردوں سے ٹکرانے لگی
شور وغوغا داد کا سن کر یہ بولے کچھ گنوار
آج تو دو ہی بجے سے رات کتیانے لگی

شہباز چونکہ عربی و فارسی اور اردو کی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان سے بھی اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے لہٰذا اپنے کلام میں ان زبانوں کا حسین امتزاج پیدا کرنے کے ساتھ اپنی علمیت اور عالمانہ شان کا بھی لوہا منوایا ہے ایک قطعہ دیکھیں۔

ہائے اس ماہِ الیکشن میں پڑھوں میں کس طرح
سورۃ شمس و قمر، فجر و فلق، فیل و بقر
حافظِ کامل تو ہوں شہباز لیکن آج کل
کر رہا ہوں آیت کرسی کا ورد آٹھوں پہر

غرض شہباز کے یہاں موضوعات کے تنوع، عصری آگہی، وسعت نظر، محاکاتی انداز فکر، علمیت، معنویت اور تہہ داری کے ساتھ زبان و بیان کا دلکش اور خوبصورت استعمال عام ہے۔صنائع و بدائع کے بھرپور استعمال کے ساتھ شوخی و ظرافت میں ندرت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔ان کے یہاں طنز کی کڑواہٹ سے زیادہ ظرافت کی لذت کا احساس ہوتا ہے۔ان کا سماجی شعور اس قدر پختہ ہے کہ ان کی کہی ہر بات تاریخی اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے۔

وہ کسی طرح کی ذات پات پر کیچڑ نہیں اچھالتے اور نہ ہی دشنام طرازی سے کام لیتے ہیں۔بلکہ ایک ہمدردانہ احساس کے ساتھ سماجی برائیوں اور اجتماعی خرابیوں کی نشاندہی کے ساتھ روح عصر کو پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔لہٰذا انیس امروہوی کا ذیل کا یہ اقتباس حقیقت پر مبنی ہے کہ:

> ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رنگ رنگ کے مضامین کو نظم کرنے کے ساتھ جو شاعر کی وسعت نظر کی دلیل ہے، ان کے معیار کلام میں کہیں کمزوری نظر نہیں آتی، جس چابکدستی اور برجستگی کے ساتھ وہ زندگی کے سماجی و سیاسی حقائق کو نظم کرتے ہیں، اسی کمال فنکاری کے ساتھ اشعار میں لطائف وظرائف کے پھول بھی کھلا دیتے ہیں۔بہرحال وہ اس عہد کے ایک ناقابل فراموش شخصیت ہیں اور ان عظیم و جمیل روایات کے علمبردار جو امروہہ سے مخصوص ہے۔''
>
> (آئینۂ اشعار)

سطور آخر میں شہباز کے متعلق اتنا کہنا چاہوں گی کہ وہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار ہیں، ان کی شاعری اپنی مثال آپ ہے جو ان کے مطمع نظر کو بھی بخوبی واضح کرتی ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر انور حسین خاں

نیورہ، ایودھیا-Mob.9794619742

نجم ردولوی......ایک فراموش کردہ شاعر

ڈر سا لگتا ہے ہمہ وقت، کوئی چھین نہ لے
بھیک میں پائی ہوئی جیسے خوشی پائی ہے

تقریباً ۴۳۔۴۴ سال پہلے کی بات ہے ہمارے والد جناب اظہر حسین مرحوم اپنے گھر پر سالانہ محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے جس کا سلسلہ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے تواتر کے ساتھ پانچ، چھ سال تک چلا ہوگا۔ان مشاعروں میں دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر عمر انصاری، سید اظہر حسین اظہر (سابق آئی اے ایس) عبرتؔ صدیقی لکھنوی اور معراج فیض آبادی جیسے مشہور ومعروف شعرا کے ہمراہ اردو کے ایک بزرگ شاعر نجم ردولوی جن کا مستقل قیام لکھنؤ میں تھا، تشریف لاتے تھے۔اُسی دوران شاعر موصوف کا نیا نیا مجموعہ ''ہنگامِ سحر'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔اس کا علمی وادبی حلقوں میں خاصا چرچا تھا۔یہ راقم السطور انھیں دنوں اردو سے ایم۔اے کر چکا تھا۔ظاہر ہے کہ بحیثیت اردو طالب علم ہمارے اندر بھی کچھ لکھنے، پڑھنے اور چھپنے کا جذبہ وشوق موجود تھا۔اُسی زمانے کی بات ہے کہ ہماری پہلی اردو کتاب بھی شائع ہوئی تھی ۔یہ حقیقت ہے کہ نجم صاحب کی شاعری سے میں بھی متاثر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے شعری مجموعہ ''ہنگامِ سحر'' کے حوالے سے ۱۹۸۰ء میں جب آپ حیات تھے، میں نے ایک مختصر سا مضمون سپرد قلم کیا تھا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ میں اس مضمون کو اب تک بالکل بھول چکا تھا۔ مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں نے اپنے دوران طالب علمی نجم صاحب کی شاعری پر کبھی کچھ لکھا بھی ہے۔ادھر کچھ دن ہوئے، پرانے کاغذات میں یہ مضمون اچانک مجھے دستیاب ہوا تو حیرت انگیز طور پر از حد مسرت ہوئی۔

مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد کسی ترمیم یا اضافے کے بغیر، میں اپنے اس مضمون کو پیش کر رہا ہوں امید ہے کہ میری اس طالب علمانہ کوشش سے ایک بھولے بسرے شاعر کی یاد تازہ ہوگی جس کا نام اور کام (Name & fame) افسوس ہے کہ لوگوں کے حافظے میں اب محفوظ نہیں رہا۔ ہمارے خیال سے شاعر موصوف کو اس بات کا خدشہ پہلے ہی سے تھا تبھی تو آپ فرماتے ہیں ۔

دنیائے محبت میں اللہ یہ سناٹا
میں خود ہی نظر آیا تا حد نظر تنہا

مضمون پیش کرنے سے پہلے ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ دوران طالب علمی جب

مجھے نجم صاحب کے متعلق کچھ لکھنے کا خیال آیا تو موصوف کے آبائی وطن ردولی کی بعض علمی شخصیات سے آپ کی سوانح نیز دیگر کوائف کے بارے میں ہم نے جب دریافت کیا تو سبھی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔اسی طرح ۱۹۷۷ء میں اردو کے ایک بزرگ ادیب ومورخ چودھری سید علی محمد زیدی مرحوم کی کتاب ''اپنی یادیں، رُدولی کی باتیں'' جب شائع ہوئی تو اس کتاب میں بھی ویسے تو بحیثیت شاعر آپ کا نام موجود ہے لیکن حالات وکوائف ندارد ہیں۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ وطن اور اہل وطن سے دوری کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ وہ وطن چھوڑنے کے بعد نہ تو کبھی اپنے وطن ردولی گئے ہوں گے اور نہ ہی اہل وطن سے کسی طرح کا سروکار رکھا ہوگا۔اس سلسلے میں آپ خود فرماتے ہیں۔

دشمن کو بھی خدا نہ کرے خانماں خراب
ہنستے ہیں ہم پہ لوگ ہمارے دیار میں

بجا طور پر ہم توقع رکھتے ہیں کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد کوئی صاحب علم وقلم آپ کی حیات، شخصیت اور شاعری پر اگر سیر حاصل گفتگو کرنے کی زحمت فرمائیں تو جہاں ایک فراموش کردہ شاعر کی خدمات کے تئیں خراج عقیدت ہوگا، وہیں ہماری نئی نسل اردو غزل کے ایک معتبر و مستند شاعر کے فن وافکار سے واقف ہو سکے گی۔

اس گفتگو کے بعد اب ہم اپنا وہ مضمون جو طالب علمی کا ہے، پیش کررہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

ہمارے یہاں یہ بات عام روایت میں شامل ہے کہ خادمانِ شعروادب کو ان کی اپنی حیات میں وہ عزت، شہرت اور عظمت نہیں ملتی ہے، جس کے صحیح معنوں میں وہ مستحق ہوتے ہیں۔اس زمرہ میں اردو کے ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر جناب سید اشرف نجم ردولوی کو بھی ہم شامل کر سکتے ہیں، جنہیں اردو دنیا آپ کی زندگی میں ہی فراموش کر بیٹھی۔

بلاشبہ نجم ردولوی کو موجودہ دور میں ایک مسلم الثبوت شاعر کی حیثیت حاصل ہے لیکن افسوس ہے کہ شاعر موصوف کی جانب نہ تو توجہ کی گئی اور نہ ہی آپ کی شاعری کو قابل اعتنا سمجھا گیا اور خود آپ نے بھی شہرت اور عزت حاصل کرنے کے لئے کسی طرح کا جتن نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ دنیائے شعر وادب میں آپ عام طور پر متعارف نہ ہو سکے۔

جناب نجم ردولوی اودھ کے ایک مردم خیز قصبہ رُدولی ضلع بارہ بنکی (موجودہ ضلع ایودھیا) میں ۱۶؍اپریل ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔آپ کا حقیقی نام سید اشرف ہے اور تخلص نجم ہے۔پندرہ سال کی عمر سے شعر گوئی کا آغاز ہوا۔اس وقت آپ اپنے ہم وطن استاد شاعر جناب محمد یوسف آثر (ولادت ۱۸۶۰ء۔وفات ۱۹۵۱ء) سے اصلاح لیتے تھے اپنے استاد کے متعلق آپ اپنے شعری مجموعہ ''ہنگامِ سحر'' میں لکھتے ہیں:

''اہل بصیرت کا خیال ہے کہ اپنے دور میں جناب اثر مرحوم ایک صاحب فن اور بہترین نقاد تھے۔''[۱]

یہاں یہ لکھنا شاید بے محل نہ ہوگا کہ نجم صاحب مختلف مقامات پر بود و باش اختیار کرنے کے بعد فی الوقت باغ گونگے نواب امین آباد، لکھنؤ میں سکونت پزیر ہیں اور بقول خود ''پیغام طلب'' کے منتظر ہیں۔

اب دیکھئے کب آتے ہیں پیغام طلب کے
سامان بندھا رکھا ہے ہر اک سفری کا
کیا جانے جلے شمع ابھی زیست کی کب تک
انداز تو سب کچھ ہے چراغِ سحری کا

ویسے نجم ردولوی ایک زود گو شاعر ضرور ہیں لیکن اپنے کلام کو یکجا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، اس سلسلے میں اگر کبھی سوچا بھی تو وہ سعی ناکام ثابت ہوئی۔ جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

''میرے دو مجموعے ابتدا سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کے ضائع ہو گئے۔''۲

یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ جسے خود آپ نے مجھے لکھنؤ میں بتایا کہ ایک مجموعہ لکھنؤ میں ایک صاحب کو کتابت و طباعت کے لیے سپرد کیا تھا لیکن بعد میں متعدد بار تقاضا کرنے کے بعد بھی وہ مجموعہ واپس نہ مل سکا (موصوف نے ان صاحب کا نام مجھ سے بتایا ہے) البتہ جو کلام موجود تھا وہ ''ہنگامِ سحر'' کے نام سے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ بقول خود (نجم صاحب) اس وقت تک یہی سرمایہ ہے۔۳

نجم صاحب کا کلام جب میں سنتا یا پڑھتا ہوں تو مجھے اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر آل احمد سرور کے وہ جملے یاد آجاتے ہیں جو اُنھوں نے اپنی مشہور کتاب ''مسرت سے بصیرت تک'' کے پیش لفظ میں لکھے ہیں:

''شاعر سے ہمارا مطالبہ صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنی نظر سے وفادار ہو، اب اُس کی نظر سوئے افلاک لے جائے یا دھرتی کے کرب اور اس دور کے انتشار کی طرف، اسے اس کی پوری آزادی ہے۔''۴

پروفیسر آل احمد سرور کے اس نقطۂ نظر سے آپ کی شاعری کا بآسانی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نجم صاحب موجودہ دور کے نئے نئے ادبی تجربات نیز طرح طرح کی تحریکات کی چکا چوند سے قطعی متاثر نہیں ہوتے ہیں، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

''دورِ حاضر کا مذاق شعری ممکن ہے، بہت اچھا ہو، مگر میں اُسے اپنا نہ سکا۔ طبیعت اُدھر رجوع نہ ہوئی، مزاج اور مذاق قبول نہ کر سکا۔''۵

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نجم ردولوی بلاشبہ اپنی فکر و نظر سے وفادار نیز اپنے مذاق شعری کے تئیں سنجیدہ اور حساس ہیں۔ وہ شمیم بارہ بنکوی (موضع بیا پور ضلع ایودھیا) کی طرح کہہ سکتے ہیں۔

میرا ہر شعر مری زیست کا آئینہ ہے
داستان گل و گلزار کی تفسیر نہیں

اسی طرح نجم ردولوی بھی کہتے ہیں۔

یہ پریشان ورق آپ اُلٹ کر دیکھیں
میرے ہر شعر میں تصویر ملے گی میری

....

خونِ دل سے مرے لکھے گئے سارے اوراق
حادثے جمع ہوئے اتنے کہ دیوان ہوا

نجم صاحب کے ان اشعار سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ آپ نے خارجی حالات کے زیر اثر شاعری نہیں کہ بلکہ اپنے قلبی تاثرات ، احساسات و جذبات کو ہی اپنے کلام میں جگہ دی۔ جب کہ یہ بات دیگر ہے کہ دُنیا کی بے ثباتی، لوگوں میں خلوص و وفا کا نہ ہونا اور پرانی اقدار کی جگہ نئے اصول واقدار کا تیزی کے ساتھ جڑ پکڑنا۔اس طرح کے بہت سے موضوعات آپ کی شاعری میں بآسانی دیکھنے کو ملتے ہیں۔لیکن یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ نجم صاحب یاسیت پسند شاعر ضرور ہیں، ہماری اس بات کی تائید کوثؔر جائسی بھی کرتے ہیں۔آپ لکھتے ہیں:

''جناب نجم صاحب کی فطرت بھی غم پرستی کی طرف مائل ہے،اور یہ اُن کا خاص اندازِ کلام ہے۔''[۶]

لیکن اُن کی شاعری کا رجحان ومیلان کچھ تو آپ کی نجی زندگی کے نشیب وفراز کے سبب ہے، اور کچھ زمانے میں اُن کے مزاج ومذاق کے خلاف ہوا چلنے کی وجہ سے ہے۔ دراصل نجم صاحب ایسے دور کی پیداوار ہیں، جس میں جاگیردارانہ نظام اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔معاشرے میں نئے نئے نظام کے جنم لینے کے سبب نئی قدریں اور نئے اصول تیزی کے ساتھ پنپ رہے تھے، جب کہ پرانے اصولوں اور قدروں کو فرسودہ سمجھا جانے لگا تھا۔ان تمام ناموافق حالات کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی ہمیشہ غم وآلام نیز متعدد پریشانیوں سے دوچار رہی، یہاں تک کہ وطن سے بے وطن ہو گئے، آبائی مکان بھی ختم ہو گیا، تو ایسے پریشان کن حالات میں شاعر اگر ''یاسیت پسند'' ہے تو تعجب کی کوئی بات بھی نہیں۔ جب کہ ان تمام ناموافق حالات کے باوجود آپ نے خلوص ومحبت، وضعداری اور جذبۂ ہمدردی نیز ایثار وقربانی کے مزاج کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ مزید خوبی دیکھئے کہ جب آپ اپنے ناپسندیدہ حالات کی شکایت بھی کرتے ہیں تو انداز ولہجہ بہت نرم اور لطیف ہوتا ہے۔

ساقیا بزم میں کچھ رند خوش اوقات بھی ہیں
وقت پر جن کے لیے شیشہ و جام آتا ہے

....

ہم کو حقیر جانو ہو صحرا میں دیکھ کے
ہم بھی پلے ہیں دامن فصل بہار کے

....

بتاؤ نجم کہ جینے کا ماحصل کیا ہے
کہ جب زمانہ مرے حسبِ حال ہی نہ رہا

لیکن ان تمام پریشانیوں اور الجھنوں کے باوجود آپ اپنے غم کو فراموش کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

پیار سے بات کوئی نجم جو کرتا ہے کبھی
بھول جاتا ہوں زمانہ غم تنہائی کا

ویسے نجم صاحب ہمیشہ صبر وضبط وشکر کے ہی خوگر رہے ہیں لیکن کبھی کبھی اپنے دل سے مجبور بھی ہوتے نظر آتے ہیں۔

جانا پڑا ہے در پہ کسی کے ہزار بار
مجبور اس طرح بھی ہوئے اپنے جی سے ہم

بلا شبہ آپ کی شاعری میں خیالات کی گہرائی اور گیرائی، جذبات میں خلوص وسچائی اور اظہار میں کیف ورنگینی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔

''(نجم) حالات سے متاثر ہوتے ہیں، اور اپنے تاثرات، درد، تڑپ، کسک اور مٹھاس کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔''ے

یہ حقیقت ہے کہ آپ کے کلام سے کسی غم زدہ انسان کے احساسات وجذبات کی سچی ترجمانی ہوتی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، چند اشعار۔

کچھ دل کی تمنائیں ، کچھ یاد کے آنسو ہیں
کیا اس کے سوا ہوتیں مجبور کی سوغاتیں

....

کس سے کہتا، کون سنتا، میری بے چینی کا حال
چپکے چپکے رات میں آنسو بہا کے رہ گیا

....

اس درد محبت کی کیا کوئی زباں سمجھے
بخشیں ہیں زمانے کی الفاظ و معانی پر

....

تم آگ لگائے بیٹھے ہو، اب آگ بجھانا مشکل ہے
قسمت کا بگڑنا سہل سہی، تقدیر بنانا مشکل ہے

....

در سے اُٹھ کے میں اب کہاں جاؤں
زندگی بھر تو جبہ سائی کی

....

مجھ کو اپنے ہی غم و آلام سے فرصت نہیں
کیا خبر ہے اُس سے کیا کہتے ہیں کیا کرتے ہیں لوگ

بعض لوگوں کے نزدیک آپ کی شاعری میں یاسیت کا عنصر کچھ نمایاں ہی غالب نظر آتا ہوگا۔ یہ بات درست ہے، جس سے مجھے بھی انکار نہیں، لیکن شاعر کے اس رجحان ومیلان سے آپ کے فکر وفن کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی شاعری دلچسپ اور معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ بصیرت، مسرت اور صداقت سے بھرپور ہوتی ہے، جس کا احساس شاعر موصوف کو بھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

بہکی بہکی میری باتیں اب تو وہ سننے لگے
کام آخر نجم اپنی بے خودی آنے لگی

۶ رمئی ۱۹۸۰ء کا لکھا ہوا میرا یہ مضمون یہیں ختم ہو جاتا ہے، لیکن ادھر حال میں دستیاب اُردو ماہنامہ ''نیا دور'' لکھنؤ کے ایک پرانے شمارے سے شاعر موصوف کی تاریخ وفات نیز بعض دوسری معلومات فراہم ہوتی ہیں، جسے زیر نظر مضمون میں شامل کرنا ضروری ہے تا کہ نجم صاحب کے متعلق میرا یہ مضمون مزید معلومات افزا ہو سکے۔

نجم صاحب کی وفات پر مذکورہ رسالہ ''نیادور'' (بابت ماہ جون ۱۹۸۳ء) میں فاضل ایڈیٹر امیر احمد صدیقی صاحب بہ طور خراج عقیدت اپنے اداریے میں رقم طراز ہیں:

''اُردو کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر نجم ردولوی بھی ۱۴؍مئی کی شب میں داغِ مفارقت دے گئے۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۷۶ سال تھی، وہ کافی عرصے سے لکھنؤ میں مقیم تھے، بلکہ ایک طرح سے لکھنؤ کے ہی ہو گئے تھے۔اُن کی شاعری لکھنؤ اسکول سے متاثر رہی۔ چنانچہ اُن کی زبان اور اُن کے اسلوب پر لکھنؤ کی زبان کے چٹخارے، نکھار اور شگفتگی کا اثر نمایاں ہے۔اُن کے انتقال سے ہم نے ایک اچھا شاعر اور پرانی قدروں نیز پرانی روایات کا ایک قابلِ قدر نمائندہ کھودیا ہے۔'' ۸

اس طرح معلومات بہم ہوئی کہ نجم ردولوی کی وفات ۱۴؍مئی ۱۹۸۳ء کی شب میں بمقام لکھنؤ ہوئی اور تدفین بھی وہیں عمل میں آئی۔

حوالہ جات:

۱ تا ۳ ''کچھ اپنے متعلق''۔مشمولہ 'ہنگامِ سحر'' از نجم ردولوی

۴ پیش لفظ ''مسرت سے بصیرت تک'' از آل احمد سرور

۵ کچھ اپنے متعلق''.....مشمولہ 'ہنگامِ سحر'' از نجم ردولوی

۶ ''تبصرہ'' از کوثر جائسی مشمولہ 'ہنگامِ سحر'' از نجم ردولوی

۷ ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'' از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، مشمولہ ''ہنگامِ سحر'' از نجم ردولوی

۸ ماہنامہ ''نیادور'' بابت ماہ جون ۱۹۸۳ء لکھنؤ

□□□

نفیسؔ انصاری خیر آبادی

پانی پت، ہریانہ- Mob.8397831185

غزل

رازداں، رازداں نہیں ہے اب
مہرباں، مہرباں نہیں ہے اب

موسم گل اداس ہے تم بن
گلستاں، گلستاں نہیں ہے اب

چل گئی ہیں ہوائیں الٹی چال
آشیاں، آشیاں نہیں ہے اب

دیر ہی سے سہی وہ مانا تو
بدگماں، بدگماں نہیں ہے اب

تم مرے ساتھ ہو تو یوں سمجھو
امتحاں، امتحاں نہیں ہے اب

کچھ کہوگے تو وہ بھی بولے گا
بے زباں، بے زباں نہیں ہے اب

کر چکا ہوں نفیسؔ اس کے نام
میری جاں، میری جاں نہیں ہے اب

●●●

اسد رضا

جسولہ وہار، نئی دہلی-Mob.9873687378

دسترخوانی اتحاد

مہربان صاحبان! اگرچہ اتحاد اور دسترخوان میں نہ تو چولی دامن کا ساتھ ہے اور نہ ہی دونوں کا ہاتھوں میں ہاتھ ہے تاہم دانشوران عظام نیز مفکرین اکرام کا کہنا ہے کہ اتحاد میں رحمت، برکت اور نعمت ہے جبکہ انتشار میں زحمت، نحوست اور لعنت ہے -اسی لیے دنیا کو پیار کی ڈور سے جوڑنے کے لیے اقوام متحدہ قائم کی گئی، امریکا کو مضبوط بنانے کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکا عالم وجود میں آیا اور سات چھوٹے عرب ملکوں نے متحدہ عرب امارات بنائی۔ ہمارے وطن عزیز میں بھی انیکتا میں ایکتا ہے یعنی تنوع میں اتحاد ہے تاہم ان سب زریں اقوال کے باوصف دنیا میں عموماً اور ادب میں خاص طور پر ماہرین وناقدین میں اختلاف وانتشار نظر آتا ہے۔

ابھی پرسوں کی بات ہے بہ قلم خود بنے علامہ، ڈاکٹر، پروفیسر صداقت خان المعروف بہ نمائش خان کے گھر پر اردو زبان وادب کے فروغ کے بارے میں غور وفکر ہو رہا تھا جس میں صدر شعبہ اردو پروفیسر ناقد صدیقی، فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے ڈین ڈاکٹر سید محقق الدین، شاعر جدت پسند معلق فاضلی، مولانا ندوی، مجتہد لکھنوی اردو، شاعر اعظم ملکی، افسانہ نگار شین۔لام رضا، طنز نویس پیرزادہ بوم مصروف بحث تھے کہ ڈاکٹر سید محقق کے اس قول پر ’’علامہ سر محمد اقبال کے خیالات ترقی پسندانہ تھے‘‘ جس پر پروفیسر ناقد بھڑک اٹھے،’’ڈاکٹر صاحب! آپ غلط فرما رہے ہیں حضرت علامہ اقبال ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ان کی کلیات میں ایسے سیکڑوں اشعار اردو و فارسی میں ہیں جن میں وہ اللہ تعالیٰ، قران مجید اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صل اللہ علیہ وصلم کی عظمت وحرمت بیان فرماتے ہیں۔مثال کے طور پر حکیم الامت کے ان اشعار پر غور فرمائیں۔

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

یا

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات

یا یہ

کرم اے شہ عرب وعجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

پروفیسر صدیقی صاحب! علامہ اقبال کو صرف اسلام اور مسلمانوں تک محدود نہ کیجیے کیونکہ وہ ایک آفاقی فکر کے شاعر ہیں جو حیات وکائنات کے تمام مظاہر پر عمیق نظر رکھتے

ہیں-اسی لیے انھوں نے یوروپی مفکرین جیسے شیکسپیر، کارل مارکس، مسولینی ولینن وغیرہ کے بارے میں بھی اشعار کہے نیز ہندوستانی عظیم ہستیوں جیسے شری رام چندر، سوامی رام تیرتھ نیز گرونانک مہاراج سے متعلق نظمیں بھی کہیں مثال کے طور پر اپنی نظم'انقلاب' میں اقبال فرماتے ہیں۔

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و ساز حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

تاہم سید صاحب! اس نظم میں بھی علامہ کی خودی کا ذکر کرتے ہیں۔'' پروفیسر ناقد نے منہ بنا کر کہا تو ڈاکٹر سید جلدی سے بولے'' جناب اقبال اپنی دوسری نظم'' اشتراکیت'' میں فرماتے ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمئ رفتار

پروفیسر صاحب! مجھے تو اقبال کا خدا بھی اشتراکی لگتا ہے تبھی تو وہ فرشتوں سے کہتا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

لیکن ڈاکٹر سید! علامہ کے ان اشعار پر بھی غور کیجیے۔

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ

ڈاکٹر سید! آپ میں شعر فہمی کا شعور تو ہے نہیں اور چلے ہیں اقبال کو ترقی پسند ثابت کرنے۔ پروفیسر ناقد نے غصّے سے کہا تو ڈاکٹر سید نے بھی آستینیں نہ چڑھاتے ہوئے زور سے کہا،'' اقبال شناسی کا ٹھیکہ تو بس آپ نے ہی لے رکھا ہے، زبان سنبھال کے بات کیجیے ورنہ!''

''ورنہ کیا کرلیں گے آپ!''

پروفیسر گرجے اور اس سے قبل کہ دونوں مایۂ ناز دانشور ہاتھا پائی پر اتر آتے شاعر اعظم ملکی آفاقی درمیان میں آ گئے اور دونوں کو سمجھانے لگے،'' پروفیسر صدیقی اور ڈاکٹر سید آپ دونوں کے نظریات انتہا پسندانہ ہیں ورنہ علامہ اقبال اسلام پرست بھی تھے اور ترقی پسند بھی۔ یوں بھی عظیم انسان محدود نظریات، مذہب، مسلک اور ذات، پات، ملک و قوم اور جغرافیائی حدود سے ماورا ہوتے ہیں۔ اب مرزا اسد اللہ غالبؔ کو ہی دیکھ لیجئے، آج تک اس بات پر دانشوروں میں اتفاق نہیں ہوسکا کہ چچا سنی تھے یا شیعہ، نصیری تھے یا خانقاہی۔

''لیکن شاعر ملکی کی بات کو فوراً مولانا ندوی نے قطع کرتے ہوئے فرمایا،'' آپ غلط کہہ رہے ہیں، مرزا غالبؔ ایک سچے سنی مسلمان تھے۔''

ملکی نے طنز کا تیر چلاتے ہوئے کہا، اسی لیے تو غالب نے یہ شعر کہا تھا۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست
مصروفِ حق ہوں بندگئ بو تراب میں

یہ سن کر مجتہد لکھنوی ترش لہجے میں بولے،'' مرزا غالبؔ اثنا عشری شیعہ تھے۔''

اس کے ساتھ ہی مولانا ندوی اور مولانا لکھنوی میں مسلکی جنگ ہوگئی، ان کی آتش طیش کو بجھاتے ہوئے ڈاکٹر سید نیئر میں نے عرض کیا، آپ غالب کے شیعہ، سنی ہونے پر جھگڑ

رہے ہیں مگر وہ تو مذہب انسانیت کو مانتے تھے،اسی لیے وہ کہہ گئے ہیں کہ ۔

وفا داری بہ شرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یہ سن کر مولانا ندوی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا،غالب دیگر مذہب سے نفرت نہیں کرتے تھے تاہم وہ مسلمان بھی تھے۔

''ارے قبلہ چچا غالب نے تو جنت کے وجود پر ہی شک ظاہر کر دیا تھا-ان کا یہ شعر دیکھئے۔''

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ڈاکٹر سید محقق الدین کی یہ دلیل سن کر مولانا کو پھر تاؤ آ گیا اور وہ آنکھیں نکال کر بولے،''آپ مرزا غالب کو ملحد و کافر ثابت کرنا چاہتے ہیں یہ ایک بڑے شاعر کی توہین ہے۔آپ کو تو مولانا بات بات پر لڑنے اور فتوے دینے کی عادت ہے- غالب نے آپ جیسے مولویوں کی طرح مسلکی دکانیں نہیں کھول رکھیں تھیں۔''

سید صاحب نے بھی طیش میں آ کر طنز کیا تو مولانا نے اپنی ریش مبارک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غصّے میں زور سے فرمایا،''آپ تو خود ملحد ہیں اور مشرکانہ و کافرانہ شعر کہتے ہیں،یہ آپ ہی کا تو مشرکانہ شعر ہے۔

نام پر خداؤں کے جو ہمیں لڑاتا ہے
دے رہا ہے وہ دھوکہ بندگی کے پردے میں

خدا صرف ایک ہے لہٰذا آپ نے خداؤں کہہ کر اپنے ایمان پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے اس شعر کے بعد آپ کا نکاح ٹوٹ گیا۔اس لئے تجدید نکاح و ایمان کیجیے ورنہ کفر کی موت مریں گے۔

یہ سن کر سید صاحب کو زبردست طیش آ گیا اور ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔آپے سے باہر ہو کر انہوں نے اپنی آستینیں چڑھا لیں اور اپنا دایاں ہاتھ مولانا کی جانب بڑھایا اور بولے،''آپ نے کیا ساری دنیا کے ایمان کا ٹھیکہ لے رکھا ہے-سب سے پہلے اللہ تعالیٰ آپ جیسے ظاہر دار مولویوں کو ہی جہنم رسید کرے گا۔''لیکن صداقت خان نے ان کا اٹھا ہوا ہاتھ پکڑ لیا''نہیں ڈاکٹر صاحب! بحث و تکرار میں ہاتھا پائی نا مناسب ہے۔مولانا آپ کو بھی صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے فتوے دینے چاہئیں۔''

میں کافرانہ اور مشرکانہ نظریات برداشت نہیں کر سکتا۔

مولانا نے ڈاکٹر سید صاحب کی ٹائی کی جانب غصّے سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو پروفیسر صدیقی نے اُن کے دست مبارک کو روکتے ہوئے سمجھایا،''قبلہٗ علمی بحث میں زبان چھلنی چاہیے ہاتھ نہیں،ڈاکٹر صاحب آپ بھی قوت برداشت کا مظاہرہ کریں۔بہر حال عالم دین کے ساتھ گستاخی مناسب نہیں۔اگر یہ صاحب،کسی اسلامی ملک میں ہوتے تو مرتد ہونے کے جرم میں انہیں موت کی سزا دے دی جاتی۔مولانا نے بہ دستور آنکھیں نکالتے ہوئے کہا تو سید صاحب بھی شیر کی طرح گرجے۔تاہم دیگر حضرات نے دونوں کو تھام لیا اور مار پیٹ کی نوبت نہیں آئی۔

دریں اثنا صاحب خانہ صداقت خان کے نوکر نے ان کے کان میں سرگوشی کی تو انہوں نے بہ آواز بلند کہا،''دوستو!گرما گرم نظریاتی و،عقائدی موضوعات پر بحث تو آپ نے ساعت فرما لی،اب گرم عشائیہ نوش کرنے کے

لیے دسترخوان پر تشریف لے چلئے۔'' یہ صدائے دل فریب سن کر مائل بہ فساد وانتشار حضرات کی تنی ہوئی بھنویں نارمل ہوگئیں، بنے ہوئے منہ سیدھے ہوگئے اور بھنچے ہوئے لب کلیوں کی طرح کھل اٹھے۔سب لوگ ایک ہی دسترخوان پر برائے شکم پروری بیٹھ گئے۔مولانا ندوی نے مجتہد لکھنوی کی جانب شامی کباب کی قاب بڑھاتے ہوئے فرمایا''حضرت کباب نوش فرمایئے۔'' تو مولانا لکھنوی نے مرغ کا ڈونگا مولانا ندوی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا،''محترم مرغ لیجیے۔'' یہ منظر دیکھ کر ہمیں مزاحیہ شاعر احمد علوی کا یہ قطعہ یاد آ گیا،آپ بھی لطف لیجیے ۔

یہ اٹل ہیں اپنے اپنے مسلکی فرمان پر
رائے ہر اک کی الگ ہے دین پر ایمان پر
قورمہ زردہ، پلاؤ پر کوئی جھگڑا نہیں
متحد ہیں مولوی بس آج دستر خوان پر

پروفیسر صدیقی نے سید صاحب کو رس ملائی پیش کی۔

ڈاکٹر سید نے پروفیسر صدیقی کی طرف زردہ کی قاب بڑھائی تو پروفیسر صاحب نے پلاؤ سید صاحب کو پیش کیا آخر میں رس ملائی اور آئس کریم کی شیرینی نے ادبی و مسلکی لڑائی کی تلخی ختم کر دی تھی۔شاعر اعظم نے علوی کے مصرع میں ترمیم کرتے ہوئے کہا۔

متحد دانشوراں ہیں صرف دسترخوان پر

اورعشائیہ کے بعد خان صاحب نے نعرہ بلند کیا۔

''دسترخوانی اتحاد!''

اورسب نے یک زبان بہ آواز بلند کہا۔زندہ باد، زندہ باد

❑❑❑

محفوظ رحمانی
مردہی ٹولہ، سیتاپور-Mob.7275543286

غزل

باپ، ماں، خالو، چچا، ماموں، بچا کوئی نہیں
ہائے مجھ کو ڈانٹنے والا رہا کوئی نہیں

اتنے میٹھے ہیں انہیں کچے ہی کھا جاتے ہیں سب
آج تک اس پیڑ کا پھل ہی پکا کوئی نہیں

ایک جیسا ہو گیا ماحول سارے شہر کا
اب کسی کو کہنے والا بے حیا کوئی نہیں

پَیر ہیں سب کے سلامت شکر ہے اللہ کا
اپنے پیروں پر مگر بیٹا کھڑا کوئی نہیں

بھوک سے جتنے مرے شرم و حیا والے مرے
ملاّ، پنڈت، پادری، بھوکا مرا کوئی نہیں

ملک ہے آزاد اپنا اور اپنی شاعری
اب رہی قیدِ ردیف و قافیہ کوئی نہیں

یہ کہا محفوظ سب نے آدمی سے تو بڑا
دیوتا کوئی نہیں ہے بھیڑیا کوئی نہیں

●●●

محمد طارق
انعامدار ہاؤس، کھولا پور، امراوتی
Mob.8055503366

دلیر خان کی دلیری

بیڈروم کی دیوار میں آویزاں گھڑی میں صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ہم ناشتے سے فارغ ہو کر پلنگ پر نیم دراز تازہ اخبار کے نئے عنوانات سے وہی پرانی، گھسی پٹی، وحشت، دہشت نفرت بھری خبریں اپنے لبوں کو الٹے 'ب' کی طرح بھینچے پڑھ رہے تھے۔ اسی اثناء فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔

بیگم صاحبہ بولیں کون؟!'' آواز آئی میں زخمی!''

بیگم صاحبہ نے کہا، یہ گھر ہے اسپتال نہیں۔''ارے بھئی۔ میں زخمی ہوں زخمی!'' اور دستک دینے والے کے لہجے میں شدت تھی۔

''زخمی ہیں تو اسپتال جایئے نا!'' بیگم صاحبہ کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔ لہجے میں تلخی اتنی نہیں تھی جتنی تلخی ہم خبروں میں محسوس کر رہے تھے۔ اس لیے ہم نے بیگم صاحبہ کی تلخی کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور مسکرانے لگے...... بیگم صاحبہ بیڈ روم کے دروازے میں کھڑی ہمیں مسکراتا دیکھ کر جھلا گئیں۔ تیوری پر بل چڑھا کر ہم سے مخاطب ہوئیں۔''دیکھئے جی کون آیا ہے، کہہ رہا ہے، میں زخمی میں زخمی!"

''دلیر خان ہوگا۔'' یہ ہم اخبار تکیے پر ڈال کر بستر سے اُٹھے۔

''مگر وہ کہہ رہا ہے، میں زخمی ... میں زخمی!''۔ بیگم صاحبہ کے لہجے میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔

''بیگم وہ شاعر ہیں، زخمی اُن کا تخلص۔''

''کیسے واہیات تخلص رکھ لیتے ہیں شاعر! زخمی، اونہہ!'' بیگم صاحبہ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر کچن میں چلی گئیں اور ہم دروازے پر پہنچ گئے۔

ہم نے جیسے ہی دروازے کے پٹ کھولے بھونچکے رہ گئے۔ چند لمحوں تک ہماری یہ کیفیت رہی، ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھیں میچ کر پھر دیکھا، نہیں ہم غلط نہیں دیکھ رہے تھے۔ ہمارے سامنے بدلے ہوئے روپ میں دلیر خاں زخمی ہی کھڑے تھے۔ شلوار، قمیص میں نہیں، جنس پینٹ اور ہاف آستین کے بوشرٹ میں ملبوس، سر اور ڈاڑھی کے سفید بالوں کو خضاب سے سیاہ کیے آنکھوں پر چشمہ لگائے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''کیوں پہچانا؟'' زخمی اپنی بتیسی دکھا کر چہکے۔

''پہلی نظر میں تو میں آپ کو پہچان نہ سکا!'' ہم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے بھی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔

''آیئے، تشریف لایئے'' ہم دلیر خاں زخمی کو ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

صوفے پر بیٹھنے کے بعد ہم نے موصوف کے بدلے ہوئے روپ کی وجہ جاننے کے لیے تمہید اس طرح باندھی۔

''زخمی صاحب! آپ اس لباس میں خوب جچ رہے ہیں۔''

یہ جھوٹ کہتے ہوئے ہم نے پوچھا مگر آپ نے حلیہ کیوں بدلا''؟

ہمارا سوال سن کر پہلے وہ گرگٹ کی طرح سر ہلا کر مسکرائے پھر بولے ''کورونا.....کورونا.....کورونا.....!''

''کورونا!''.....ہم نے بھوئیں سکیٹر کر وضاحت چاہی۔

دلیر خان زخمی بولے، آپ نہیں جانتے کورونا وائرس بوڑھے لوگوں پر جلد حملہ آور ہو جاتا ہے اس لیے ہم نے اسے چکمہ دینے کے لیے یہ آئیڈیا نکال لیا۔ کیوں، کیسا رہا ہمارا آئیڈیا؟'' انہوں نے پھر اپنی مصنوعی بتیسی دکھائی جو ٹوتھ برش سے اچھی طرح صاف کی ہوئی تھی۔

ہم نے منہ ہی منہ دانت پیسا، ''زخمی، بوڑھے کھوسٹ! جس طرح تیری شاعری میں حماقتیں ہیں اسی طرح تیرا یہ آئیڈیا بھی اللہ احمقانہ ہے۔'' یہ ہم نے دل میں کہا۔ بظاہر ہم ان کی بات سن کر پوری شرافت سے مسکرا رہے تھے اور دلیر خان زخمی ہماری مسکراہٹ سے پوری طرح محظوظ ہو رہے تھے۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہمیں ایسا ہی لگ رہا تھا۔

چند لمحے مسکرا کر ہم نے ان سے کہا۔ ''زخمی صاحب! کورونا وائرس آپ کو اس حلیہ میں متاثر کرے یا نہ کرے مگر آپ کے اس حلیہ سے وہ عورتیں یقیناً متاثر ہو جائیں گی۔''

''کون سی عورتیں؟!'' دلیر خان زخمی بے تابی سے صوفے پر تھوڑا آگے کھسکے۔ ''وہ عورتیں جو بوڑھی ہو چکی ہیں!''

''اُوں....!'' دلیر خان زخمی صوفہ پر اچھل کر ایسے بیٹھ گئے کہ ہمیں ''انگور کھٹے ہیں۔'' کہانی والی لومڑی یاد آ گئی۔ کس کی حرکت پر کیا یاد آ جائے یہ اپنی ذہنیت پر منحصر ہے۔ وہ تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان کہ وہ دل کے بھیدوں کو ظاہر نہیں کرتا۔ خیر!

دلیر خان زخمی کھانستے، کنکھارتے ہوئے صوفہ پر کچھ اور آگے کھسکے اور ہم نے اُن سے سوشل ڈسٹنسنگ Social Distancing بنائے رکھا جیسا کورونا سے بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر میں بتایا گیا تھا۔

''ڈریے مت، میں کورونا کا مریض نہیں ہوں، یہ کھانسنے کنکھارنے کی میری پرانی عادت ہے۔''

ہم نے جواب میں منہ نہ کھولا اور اپنے صوفہ پر سمٹ گئے، ہمیں سمٹتا دیکھ کر دلیر خاں زخمی نے دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''چند اشعار سنانے کے لیے آپ کے دولت کدہ پر آیا ہوں۔''

''تف!'' ہم دل میں بولے اور زبان سے کہا۔ ''ارشاد'' کیوں کہ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ شاعر ''ارشاد'' سننے کے بعد ہی اپنا منہ کھولتا ہے۔

ہمارے ذہن سے کلمہ ارشاد سنتے ہی دلیر خاں زخمی نے اپنا منہ کھولا اپنی بے سُری آواز میں لہک لہک کر بے وزن، بے تکے، بکواس اشعار ہمیں سنانے لگے اور ہم خود کو کوسنے لگے۔ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ ہم نے دلیر خاں زخمی جیسی ہستی کو منہ لگایا جو اپنے گھر میں اہل و عیال کے لیے بن بلائی مصیبت تو ہے ہی اور گھر سے باہر ہم جیسے بے ضرر، شریف النفس کے لیے آفت، اس اذیت دہ احساس کو برداشت کرتے ہوئے ہم ان کی تک بندی پر 'واہ واہ' کرتے رہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے یہ بات بھی ہمارے ذہن میں تھی۔

آٹھ دس اشعار کی آدھے گھنٹے تک جگالی کرنے کے بعد دلیر خاں زخمی ہمارے ادبی ذوق کو زخمی کر کے رخصت ہو گئے اور ہماری جان میں جان آئی۔

دلیر خاں زخمی کی رخصتی کے بعد ہمارے دل میں کورونا کے خوف پر دلیر خاں زخمی کا خوف حاوی آ چکا تھا۔

❑❑❑

تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا لازمی ہے۔

تبصرے

نام کتاب	:	ایسے ایسے لوگ
مصنف	:	ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی
صفحات	:	۱۱۲
قیمت	:	۱۵۰/- روپئے
سنہ اشاعت	:	۲۰۲۲ء
مبصر	:	رحمت لکھنوی
موبائل نمبر	:	9305416429

زیر تبصرہ کتاب ''ایسے ایسے لوگ'' ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کے شخصی و تاثراتی مضامین اور مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کا نام اردو حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ موصوف کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں اور قلم کاروں کی صف میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو زبان و ادب کی گرانقدر خدمات کو سرانجام دیا ہے جو ان کی خداداد صلاحیتوں کا غماز ہے۔ موصوف نے نثری مضامین مزاحیہ خاکوں اور تخلیقات کے علاوہ شعر و سخن میں بھی امتیاز حاصل کیا ہے۔ موصوف نے اپنی تحریروں سے اردو عوام اور خواص دونوں طبقات کو متاثر کیا۔ ان کی مطبوعہ کتب کی تعداد سولہ ہے۔ ان کی تصانیف عکس شعور ۱۹۷۸ء، بلا عنوان، ۱۹۸۱ء، سات سمندر پار سے بچوں کے لئے غیر ملکی کہانیوں کے تراجم انگریزی سے اردو میں ۱۹۸۳ء، الف سے قطب مینار طنزیہ و مزاحیہ مضامین، انشائیے ۱۹۸۵ء، ناٹ آؤٹ ۱۹۸۹ء، سنو بچوں ۱۹۹۰ء، باقی آئندہ ۲۰۰۱ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین اردو سے مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب ''ایسے ایسے لوگ'' ہے۔ موصوف نے اس کتاب کا انتساب اپنے دو مرحوم دوستوں کے نام کیا ہے ایک شاعر و صحافی شعور اعجاز اور دوسرے مصنف کے رفیق دیرینہ محمد ایوب صاحب مرحوم ہیں۔ مصنف کتاب کی تحریر صفحہ ۴ پر بعنوان ''پیش لفظ'' سے اقتباس نذر قارئین ہے جس سے اس کتاب کی غرض و غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق یہ مضامین مرحومین کو میرا خراج عقیدت ہے اور صاحبان خاکہ کے تئیں اظہار اپنائیت ہے۔ اس کتاب میں شخصی و تاثراتی مضامین کی تعداد ۱۰ ہے۔ مزاحیہ خاکے ۷ ہیں۔ ان میں مصنف کتاب نے اپنی صلاحیتوں کا ہنرمندی سے جائزہ پیش کرنے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑی۔

مصنف کتاب نے جن شخصیات پر مضامین قلمبند کئے ہیں ان شخصیات سے مصنف کا ادبی تعلق اور رشتہ جذبات و احساسات کے دریچے وا کرتا ہے۔ مصنف نے جن ادبی شخصیات پر خامہ فرسائی کی ان سے اردو ادب کی کہکشاں

روشن اور تابندہ ہے۔ مزاحیہ خاکوں میں بھی شائستگی اور سلیقہ مندی جھلکتی ہے۔ طنز و مزاح کے پہلوؤں سے مصنف نے جن زخموں کو کریدا اور چھیڑا ہے اس میں فاضل مصنف کی فنکاری کا بڑا دخل ہے۔ اس موقع پر میں معروف ادیبہ عصمت چغتائی کے مضمون کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ''آج ادیبوں کا قلم زندگی کے اتار چڑھاؤ کا ماتم کرنے کے بجائے اس نظام کا مذاق اڑا رہا ہے۔ انجانے خدشوں سے بدحواس ہونے کے بجائے ان پر ہنس رہا ہے۔ طنز و مزاح وہ نشتر ہے جو فاسد مواد کو نکالنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔'' آگے یوں تحریر کرتی ہیں۔ ''شیخ رحمٰن اکولوی، وقت کا تقاضا ہے کہ بات پر لطف انداز میں کہی جائے کہ انسان آج بڑا الجھا ہوا اور دکھی ہے۔ مار دھاڑ اور بیہودہ کود پھاند سے لبریز فلموں نے نوجوانوں کو بدحواس کر دیا ہے۔ رحمٰن اچھے جا رہے ہو تمہاری چیزیں ادھر ادھر دیکھ رہی ہوں۔'' کتاب کا ٹائٹل کور مشاہیر ادیبوں کی تصویروں سے آراستہ ہے اس میں مصنف کی موجودگی ادبی شخصیات سے حسن تعلق کی دلیل پیش کرتی ہے۔ بیک کور پر شیخ رحمٰن اکولوی مشاہیر کی نظر میں، بحیثیت انشائیہ نگار، مصنف کے بارے میں گوپی نارنگ، آپ کی تحریریں باوقار انشائیہ نگاری میں اضافہ ہیں علیم اللہ حالی کے خیال میں اکولوی اس فن کی بلندی پر پہنچ کرا کیلے نظر آتے ہیں۔ طنز و مزاح نگار کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی رقمطراز ہیں۔ ''بلاعنوان بہت پسند آئی۔ آپ بلاوجہ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔ ویسے ہی ہندوستان میں اب اچھے مزاح نگار کم رہ گئے ہیں۔ ''الف سے قطب مینار'' ایک ہی نشست میں پڑھ لی اس سے زیادہ اس کی کیا تعریف ہوسکتی ہے۔'' خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں۔ ''اس میں شک نہیں کہ کنہیا لال کپور کے انتقال کے بعد ان کی جگہ پر کرنے کے لئے ایک طنز و مزاح نگار شیخ رحمٰن اکولوی کی پیدائش اردو ادب کے خاندان میں ہوگئی۔'' مذکورہ باتوں سے اس بات کا اندازہ لگانا قارئین کے لئے بیحد آسان ہوگا کہ مصنف کمال فن سے واقف ہیں۔

اس لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب لائق مطالعہ ہے قیمت بھی نہایت مناسب ہے۔

❑❑❑

نام کتاب	:	حدیث بتاں (شاعری)
شاعر	:	ڈاکٹر زبیر صدیقی
صفحات	:	۲۴۸
قیمت	:	۔/۲۰۰ روپئے
سنہ اشاعت	:	۲۰۲۱ء
ملنے کے پتے	:	۱۔ڈاکٹر زبیر صدیقی، محلّہ املیا باغ، قصبہ سندیلہ، ضلع ہردوئی ۲۔دانش محل امین آباد، لکھنؤ
مبصر	:	ضیا فاروقی (بھوپال)
موبائل نمبر	:	9685972242

ڈاکٹر زبیر صدیقی مسکن خوش نگاراں سندیلہ کے ایک معزز علمی گھرانے کے فرد ہیں۔ انھوں نے ان بزرگوں کی نہ صرف یہ کہ آنکھیں دیکھیں جو آزادی کے بعد بساط سخن پر اپنے فکر و فن کے چراغ روشن کئے ہوئے تھے بلکہ فکری طور پر متاثر بھی ہوئے۔ وہ بسلسلۂ ملازمت ایک طویل عرصہ تک

ملک کے مختلف شہروں میں کارمنصبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ وہاں کی سماجی،تہذیبی اورشعری روایات سے بھی متعارف ہوتے رہےاوران سےحسب ضرورت استفادہ بھی کرتے رہے۔ملازمت سے سبکدوش ہوکر جب وطن عزیز سندیلہ واپس آئے تو یہاں کی کسی حدتک اجڑی بساط سخن کو ازسرنو تازہ کیا۔انجمن ترقی اردو اور دوسری ادبی انجمنوں کو فعال کرنے میں اپنے تجربات اور مشاہدات کو بروئے کار لائے۔بزم سلام سندیلوی کے تحت مشاعرے اورنشستوں کے ساتھ ساتھ اعزازات کا سلسلہ بھی شروع کیا اوراس طرح آج سندیلہ کے شعری منظرنامہ کواسی طرح روشن کردیا جیسا کہ ماضی میں ہوا کرتا تھا۔

جہاں تک ان کی شاعری کاتعلق ہےتو ان کی بساط سخن میں وہ سارے رنگ موجود ہیں جو بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کی گویا شناخت ہیں۔زبیرصدیقی کے یہاں ماضی کی مختلف تحریکوں اوررویوں کی صدائے بازگشت بھی ہے اورعصری کیف وکم کا منظرنامہ بھی۔رواں بحروں میں روزمرہ کے مشاہدات اورتجربات کوزبیرصدیقی نے جس طرح شعری پیکرمیں ڈھالا ہے وہ متاثرکن بھی ہےاور جاذب نظربھی۔

اچھے اچھوں کو سر نگوں دیکھا
ہائے کیا چیز ہے ضرورت بھی

....

آنگن میں اتر آیا ہے افلاس کا سورج
اے کاش کوئی نیند کے ماروں کو جگا دے

....

تلخیاں، مجبوریاں، ناکامیاں، رسوائیاں
آنے والا میرے گھر ان کے سوا کوئی نہیں

....

اس طرح دیکھ کے وہ مجھ کو گزر جاتے ہیں
راہ رو جیسے کوئی میل کا پتھر دیکھے

....

ہم زیست کے راہوں میں مل جائیں یہ ناممکن
گزرے ہوئے لمحے بھی کیا لوٹ کے آئیں گے

....

آنگن کو سجانے میں بازو ہی گنوا بیٹھے
حسرت تھی کہ بچوں کو باہوں میں کھلائیں گے

....

ہم نے پاپی پیٹ کی خاطر دنیا میں
بچپن کو رسی پر چلتے دیکھا ہے

یہ اوراس طرح کے اشعار میں زندگی کے نشاط وملال کے وہ سبھی رنگ ہیں جن سے اس مادی دنیا میں ہمارا روز کا سابقہ پڑتا ہے یا جو ہماری حسیت کو براہ راست متاثر کرتے ہیں

مجھے خوشی ہے کہ زبیر صاحب نے ''حدیث بتاں'' کے نام سے اپنا شعری مجموعہ طبع کرایا ہے جس میں اردو شاعری ہی نہیں سندیلہ کی تہذیبی روایات کے چراغ بھی روشن ہیں۔

''حدیث بتاں'' کواترپردیش اردو اکادمی نے انعام سے نواز کرزبیرصدیقی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔اس کے لئے اکادمی کا شکرگزار ہونا چاہیے۔مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کوخاطرخواہ نگاہِ قدر سے دیکھا جائے گا۔

❑❑❑

R. No. 25039/72
U.P. Urdu Akademi
Khabarnama
उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा
اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ
Vol. No. 51 May - June 2023 Issue No. 11, 12

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی نئی کتابیں